الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی اور علمی ترجمان

ماہنامہ

اشرفیہ

مبارک پور

انقلاب 1857ء کے کچھ مضمرات وحقائق
انقلاب 1857ء مسائل ومباحث
انقلاب 1857ء کے چند فکر انگیز پہلو

انقلاب 1857ء میں فارسی اور اردو شعر وادب کا کردار
انقلاب 1857ء کی سرکردہ شخصیات
انقلاب 1857ء اور مابعد انقلاب 1857ء

انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر

مبارک حسین مصباحی

مِلّت کے نام حضرت عزیزِ مِلّت کا پیغام

حضرات گرامی ۔۔۔۔۔۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج اسلام اور سنیت کو مختلف چیلنجوں کا سامنا ہے اور ہر محاذ پر مقابلہ کے لئے ماہر و معتبر علما، کی جماعت ضروری ہے اور ایسے ماہرین پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے تعلیمی شعبوں کو مزید آگے بڑھائیں اور فضیلت وغیرہ سے فارغ ہونے والے علمائکے لئے تحقیق اور مطالعہ کے لئے کچھ ایسے تربیتی شعبے قائم کریں جن میں اسلام وسنیت کے ساتھ دیگر مذاہب مثلاً یہودیت، عیسائیت، قادیانیت، رافضیت وغیرہ پر گہری نظر رکھنے والے الگ الگ گروپ تیار ہوں جو تقریری اور تحریری طور سے باطل کا جواب دے سکیں اور ان میں بھی الگ الگ ممالک اور مختلف زبانوں کے لحاظ سے افراد تیار ہوں جو بیرونِ ملک بھی اسلام اور سنیت کی حفاظت کا فریضہ انجام دے سکیں۔ اسی طرح پیدا شدہ حالات کی روشنی میں نئے نئے فقہی سوالات بھی جنم لے رہے ہیں جن کے حل کیلئے ماہر فقہا اور مفتیان کی تخریج ضروری ہے۔ جبکہ ابتدائی فارسی وعربی سے عالم فاضل تک کورس کو مزید مستحکم و نتیجہ خیز بنانے اور زیادہ سے زیادہ اچھے افراد پیدا کرنے کی ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے نصاب کی اصلاح اور نئی کتابوں کی تیاری کے لئے بھی تجربہ کار اہل قلم کا ایک بورڈ ضروری ہے کہ ادارے کو اسلامی یونیورسٹی کی شکل دینے کے لئے کالج کی سطح کے مختلف شعبوں کا قیام اور ان کا معقول انتظام بھی ہمارے سامنے ہے۔ لیکن ان منصوبوں کی تکمیل کے لئے مختلف اسباب و وسائل کی ضرورت ہے ان میں سے ایک اہم مسئلہ سرمایہ کی فراہمی کا بھی ہے۔ کیونکہ ہماری سرپرستی کے لئے کوئی حکومت نہیں ہے، جو دینی منصوبوں کی روشنی میں مصارف کا انتظام کرے۔ ہماری ضروریات غریب مسلمانوں اور قوم کے اہل خیر حضرات ہی سے پوری ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پھیلاؤ اور تعلیمی وتعمیری منصوبوں کے پیش نظر اہل خیر حضرات کی مزید توجہ اور اعانت کی سخت ضرورت ہے۔ اسکے لئے بعض اہل خیر نے یہ تجویز رکھی ہے کہ پورے ملک سے دس ہزار ایسے ممبر بنائے جائیں جو کم از کم ایک بار گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے کا تعاون پیش کریں اور ادارہ ان کو اعزازی رکنیت کی سند بھی عطا کرے، اگر اس مطلوبہ تعداد میں ممبر سازی مکمل ہو جاتی ہے تو اگلے بہت سے منصوبوں کی تکمیل آسان ہو جائے گی۔ اس تجویز کی روشنی میں ہم آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ دین کے فروغ و استحکام اور قوم مسلم کی سربلندی کے لئے آپ خود بھی مخلصانہ قدم بڑھائیں اور اپنے احباب متعلقین کو بھی تیار کریں اور ایسے حضرات کی نشاندہی فرمائیں جن کو اس کار خیر میں شریک کیا جا سکے۔ امید ہیکہ آپ رکنیت فارم پر کرنے کے ساتھ اپنی رقم گیارہ ہزار ایک سو گیارہ (RS.11,111) دستی یا الجامعۃ الاشرفیہ کے نام ڈرافٹ بنوا کر بہت جلد ارسال فرمائیں گے اور دوسرے ایسے اہلسنت کے پتے بھی فراہم کریں گے جن سے رابطہ کیا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دارین کی سعادتوں سے نوازے اور دینی کاموں میں حصہ لینے کی پوری توفیق عطا فرمائے اور ہر قسم کی مصیبت و پریشانی سے محفوظ و مامون رکھے (آمین)

عبد الحفیظ عفی عنہ

(سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور)

۷۸۶

الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی اور علمی ترجمان

بیادگار: حضور حافظِ ملت علامہ شاہ الحاج عبد العزیز قدس سرہ بانی الجامعۃ الاشرفیہ

زیرِ سرپرستی

عزیز ملت حضرت علامہ شاہ الحاج عبد الحفیظ صاحب قبلہ سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ

ماہنامہ اشرفیہ

شعبان رمضان ۱۴۲۹ھ — اگست - ستمبر ۲۰۰۸ء

جلد نمبر ۳۲ شمارہ ۹-۸

ترسیل زر و مراسلت کا پتہ	THE ASHRAFIA MONTHLY	
دفتر ماہنامہ اشرفیہ، مبارکپور اعظم گڑھ یو۔ پی۔ ۲۷۶۴۰۴	Mubarakpur. Azamgarh (U.P.) India. 276404	اس شمارے کی قیمت : 25 روپے سالانہ: 130 روپے
چیک اور ڈرافٹ بنام مدرسہ اشرفیہ بنوائیں	کوڈ نمبر —— 05462 دفتر ماہنامہ اشرفیہ —— 250149 الجامعۃ الاشرفیہ —— 250092 دفتر اشرفیہ ممبئی فون/فیکس 23726122	سری لنکا، بنگلا دیش، پاکستان، سالانہ 400 روپے دیگر بیرونی ممالک $ 15 امریکی ڈالر 10€ پونڈ

نوٹ: آپ ماہنامہ اشرفیہ ہر ماہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

http://www.aljamiatulashrafia.org E.mail: info@aljamiatulashrafia.org

مولانا محمد ادریس مصباحی نے نشاط آفسیٹ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

اداریہ

انقلاب 1857ء - مسائل و مباحث

انقلاب 1857ء کے چند فکر انگیز پہلو

انقلاب 1857ء میں فارسی اور اردو شعر و ادب کا کردار

انقلاب 1857ء کی سرکردہ شخصیات

انقلاب 1857ء اور ما بعد انقلاب 1857ء

خیر و خبر

اداریہ

انقلاب 1857ء کے کچھ مضمرات وحقائق

مبارک حسین مصباحی

انقلاب 1857ء کا ہندستان کی آزادی میں بڑا تاریخی اور کلیدی کردار رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ 1857ء میں ہندستانی مجاہدین بظاہر جنگ ہار گئے تھے مگر اس کے خاکستر میں کچھ چنگاریاں ضرور رہ گئی تھیں، جنھوں نے بعد میں حکومت برطانیہ کو دھواں دھواں کیا۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ رنگ لایا، غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں اور ہندستان برطانوی جبر وظلم کے چنگل سے آزاد ہوا، اس لیے 1857ء کے مجاہدین کی قربانیوں کو یاد رکھنا ہمارا قومی فریضہ بھی ہے اور تاریخی ذمہ داری بھی۔

انقلاب 1857ء خاکِ ہند میں برطانوی سامراجوں کے خلاف پہلی خوں ریز جنگ نہیں تھی بلکہ برطانیہ کے جبر واستحصال کا ہمارا ملک صدیوں شکار رہا ہے۔ 1601ء سے 1756ء تک برطانوی تاجروں نے اسے لوٹا کھسوٹا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پلیٹ فارم سے بنگال کی صنعت، تجارت اور زراعت کو اپنا پہلا نشانہ بنایا۔ اسی طرح اس نے دوسرے صوبوں کو بھی اپنی تجارتی سازشوں کا نشانہ بنایا۔ جب یہ کمپنی مالی اعتبار سے مستحکم ہوگئی تو پوری توانائی کے ساتھ 1757ء میں اس نے پلاسی کے میدان میں اپنی عسکری جارحیت کا آغاز کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندستانی راجوں مہاراجوں اور نوابوں سے درجنوں چھوٹی بڑی جنگیں کیں۔ مگر 1857ء کی جنگ انگریزوں کے خلاف ایک ہمہ گیر عوامی انقلاب تھا جس نے پہلے مرحلے میں برطانوی سامراجوں کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ اس میں دہلی، دوآبہ، روہیل کھنڈ، بندیل کھنڈ اور اودھ سے آرہ (بہار) تک لاکھوں عوام براہِ راست شریک تھے، جو لاکھوں لاکھ کی تعداد میں ملک ووطن کے لیے اپنے جان ومال کی بے دریغ قربانیاں دے رہے تھے۔

انقلاب 1857ء کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ علماے اہل سنت نے اس جنگ کو جہاد کا نام دیا تھا۔ علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا کفایت علی کافی مرادآبادی، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، سید مبارک شاہ رام پوری، مولانا رضا علی بریلوی وغیرہ سیکڑوں علما نے فتویٔ جہاد کی اپنے اپنے علاقوں میں خوب تشہیر کی اور ملک بھر میں ایثار وقربانی کی عام لہر پیدا کردی۔ یہ اسی فتویٔ جہاد کا اثر تھا کہ ہزاروں ہزار علما نے اس جنگ میں حصہ لیا اور جیل کی سلاخوں سے لے کر پھانسی کے پھندوں تک کا سفر بہ آں عزم وحوصلہ مسکراتے ہوئے طے کیا۔

انقلاب 1857ء کے اسباب کیا تھے، یہ ایک اہم بحث ہے جسے بار بار اٹھایا جاتا ہے، ہم انتہائی اختصار کے ساتھ اس پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ہندستانی زمینوں کا اصل فائدہ انگریز حاصل کر رہے تھے۔ ہندستانی تجارت وصنعت کو انھوں نے اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑ لیا تھا اور اس کا بیش تر فائدہ برطانیہ کو پہنچ رہا تھا۔ سوچی سمجھی سازش کے تحت ہندستانی عوام کو جاہل رکھنے کی کوشش کی جارہی تھی، یا انھیں ایسی تعلیم دینے کی کوشش کی جارہی تھی کہ ہندستانی ہونے کے باوجود ان کا دل ودماغ انگریزوں جیسا ہو جائے۔ ہندو مسلم منافرت پھیلائی جارہی تھی، اور سماجی رسم وروایات کے تار وپود بکھیرے جارہے تھے۔ پادریوں اور مشنری اسکولوں کے ذریعہ دین ومذہب پر حملے کیے جارہے تھے بلکہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی جارہی تھی، علما ومشائخ کی توہین کی جارہی تھی، ان سب میں مذہب سب سے اہم تھا۔ عام طور پر مسلمانوں اور دیگر ہم وطنوں میں یہ خوف پنپ رہا تھا کہ ہماری نسلوں کو جبراً عیسائی بنا دیا جائے گا۔ ہندستان کو انگریزوں نے مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینا تھا، اس لیے انگریزوں کے خلاف مسلمانوں میں غم وغصہ بھی زیادہ تھا اور انگریزوں کے خلاف مسلم عوام اور علماے کرام پیش پیش بھی تھے۔

1857ء کی عام ناراضی کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے عدالت عالیہ مدراس ممبر کونسل سر میلکم لوئن نے لندن کے ایک رسالے میں لکھا تھا۔

’’ہم نے ہندستانی ذاتوں کو ذلیل کیا، ان کے قانون وراثت کو منسوخ کیا، بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا، مذہبی رسم ورواج کی توہین کی، عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کیں، سرکاری کاغذات میں انھیں کافر لکھا، امرا کی ریاستیں ضبط کیں، لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا، انھیں تکلیف دے کر مال گزاری وصول کی، اونچے خاندانوں کو برباد کر کے انھیں آوارہ گرد بنا دینے والے بندوبست کیے۔‘‘ (روشن مستقبل، ص:109-110)

انگریزوں کی ایک انتہائی بھیانک سازش یہ تھی کہ وہ نئی نسلوں کے فکری ارتداد کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہے تھے، وہ چاہتے تھے کہ خاکِ ہند کے ساتھ باشندگانِ ہند کے دل ودماغ پر بھی ہمارا قبضہ ہو، بلکہ وہ انھیں عیسائی بنانا چاہتے تھے۔ اپنے اس مقصد کے لیے انگریز درس گاہوں کا بھی استعمال کر رہے تھے۔ سر چارلس ٹرپولین کہتا ہے:

’’میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے، اسی طرح یہاں بھی سب کے سب عیسائی ہو جائیں گے۔ ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم بلا واسطہ پادریوں کے ذریعہ اور بالواسطہ کتابوں، اخباروں اور یورپنوں سے بات چیت وغیرہ کے ذریعہ نفوذ کرے گی۔ حتیٰ کہ عیسوی علوم تمام سوسائٹی میں نفوذ کر جائیں گے، تب ہزاروں کی تعداد میں عیسائی ہوا کریں گے۔‘‘ (تاریخ التعلیم، ص:69، از: سید محمود)

اسی خفیہ سازش کی نشان دہی کرتے ہوئے لارڈ میکالے لکھتا ہے:

’’ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعبار سے ہندستانی ہو مگر ذوق اور راے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہوں۔‘‘ (تاریخ التعلیم از میجر باسو، ص:105)

ان چند حوالوں کی روشنی میں آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انقلاب 1857ء کے اسباب کیا تھے اور مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت وبیزاری کے اسباب وعلل کیا تھے۔

یہ بات تو بار بار دُہرائی جاتی رہی ہے کہ اگر خاک ہند میں 1857ء کی جنگ نہ لڑی گئی ہوتی تو 1947ء میں ہندستان کو پروانۂ آزادی میسر نہ آتا۔ 1857ء سے 1947ء کا بڑا گہرا رشتہ ہے۔ مگر افسوس، مسلمانوں نے جس بے جگری سے 1857ء کی جنگ لڑی تھی اور جس عزم وحوصلہ کے ساتھ جان ومال کی قربانیاں پیش کی تھیں، آزاد ہندستان میں ان کا کما حقہ اعتراف نہیں کیا گیا، بلکہ اکثر علما اور مجاہدین کے تاریخ سے نام تک محو کردیے۔

گزشتہ ڈیڑھ صدی کے اندر 1857ء کے تعلق سے بہت کچھ لکھا گیا مگر اس سے زیادہ نظر انداز کر دیا گیا۔ تاریخ نگاری سے زیادہ تاریخ سازی کی گئی۔ عام تاریخ نگاروں نے مسلم مجاہدین کی قربانیوں کو نظر انداز کیا، جب کہ مسلم مورخین نے مسلکی تعصبات سے کام لیا۔ دیوبندی اور وہابی مکاتبِ فکر کا انقلاب 1857ء میں سرے سے کوئی کردار ہی نہیں تھا۔ مگر افسوس، اس تعلق سے ایسی منصوبہ بند تاریخ سازی کی گئی کہ انگریزوں کے وفاداروں کو دشمن ثابت کیا گیا اور انگریزوں کے حاشیہ برداروں کو مجاہدین کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ہم نے اس نمبر میں بطورِ خاص اس رخ پر حقائق بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اربابِ قلم نے بھرپور دلائل وشواہد کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ انقلاب 1857ء میں اصل مجاہدین اہل سنت وجماعت تھے، فتویٔ جہاد دینے والے بھی علماے اہلِ سنت تھے اور جنگ وجہاد میں پیش پیش بھی علماے اہل سنت تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب انقلاب 1857ء ناکام ہوا تو انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ علماے اہلِ سنت بنے۔ جزیرہ انڈمان میں قید وبند کی صعوبتوں سے گزرے، گولیوں کا نشانہ بنے، پھانسی کے پھندوں کو چوما، گھر سے بے گھر ہوئے، بے وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ دہلی، لکھنؤ اور میرٹھ وغیرہ شہر وقصبات علماے اہل سنت سے خالی ہوگئے۔ ہزاروں ہزار علماے اہلِ سنت نے شہادت کا جام نوش کیا۔ اس کے برخلاف جو انگریزوں کے وفادار تھے انھیں خوب مراعات ملیں اور ان شہروں میں ان کا دین ومذہب بھی خوب پھلا پھولا۔ اس نمبر میں یہ تمام حقائق دلائل وشواہد کی روشنی میں آگئے ہیں۔ صفحات کی قلت دامن گیر ہے، بہت سے اہم مضامین نظر انداز کر دیے، اسی وجہ سے اداریے کو بھی مختصر کیا گیا۔ نمبر مختصر ہونے کے باوجود معنوی حیثیت سے کس اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ ☆☆

انقلاب 1857ء

2007ء میں انقلاب 1857ء کے حوالے سے ملک کے طول و عرض میں کافی سرگرمیاں رہیں۔ تحریکِ آزادی پر سمینار، سمپوزیم اور کنونشن منعقد کیے گئے۔ ہر طبقہ فکر نے اپنے اپنے طور پر 1857ء کے مجاہدین کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ رسائل و جرائد کے نمبرات بھی آئے۔ انقلاب 1857ء میں حب الوطنی کے حوالے سے اہلِ سنت کا بھی ایک روشن اور قابلِ فخر باب ہے جس پر عام طور سے پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب اہلِ سنت کا فکری و قلمی جمود اور کوتاہی بھی رہا۔

حسب اعلان ماہ نامہ اشرفیہ کا انقلاب 1857ء نمبر شائع ہو رہا ہے۔ اس پس منظر میں چند سوالات حاضر خدمت ہیں۔

1- ہندستان ایک جمہوری ملک ہے۔ اس کی آزادی میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ کوشش کی مگر آزادی کے بعد سے مسلسل قومی تاریخ و نصاب سے مسلم مجاہدینِ آزادی نظر انداز کیے جا رہے ہیں۔ اس کے اسباب کیا ہیں؟ ہندوؤں کا تعصب یا اپنی بے حسی؟

2- مسلم مجاہدینِ آزادی کے ساتھ متعصبانہ رویے کے خلاف علما اور مسلم قائدین کا ردِ عمل اب تک کیا رہا ہے اور اس تعلق سے اپنے حقوق کے لیے علما و قائدین کا منصوبہ کیا ہونا چاہیے؟

3- کہا جاتا ہے کہ اردو تاریخ نگاروں نے انقلاب 1857ء کے سنی مجاہدین کو نظر انداز کیا ہے، اس کے اسباب کیا ہیں؟ نظریاتی تعصب یا سنی اربابِ قلم کی کوتاہی یا علماے اہلِ سنت میں قومی فکر کا فقدان؟

4- کیا انقلاب 1857ء میں دیوبندی مکتب فکر کا وجود تھا، بصورت اثبات 1857ء کی تحریک آزادی میں علماے دیوبند کا کیا کردار رہا؟

5- برطانوی عہد کے انگریز حکمرانوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے نظریے پر عمل کیا۔ کیا مسلمانوں میں فرقہ بندی بھی انگریزوں کی سازش کا نتیجہ ہے؟

6- برطانوی عہد میں حکومت کے وفادار کون کون فرقے تھے؟ تاریخی شواہد کے ساتھ جواب دیں۔

7- انگریزوں کے خلاف کن علما نے جہاد کا فتویٰ جاری کیا تھا؟ کیا یہ صحیح ہے کہ مولوی اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی نے جہاد کے فتوے پر دستخط نہیں کیے تھے اور ان کی پوری جہادی مہم انگریزوں کے بجائے مسلمانوں کے خلاف تھی؟

از: مبارک حسین مصباحی

انگریزی پنجۂ استبداد سے اپنے ملک کو نجات دلانے میں علماے کرام پیش پیش رہے

اپنی تاریخ مرتب کرنا ہر قوم و ملت کا خود اپنا فریضہ ہے

از: مولانا یسین اختر مصباحی، دار القلم، ذاکر نگر، نئی دہلی

انقلاب 1857ء ہندستانی تاریخ کا ایک درخشاں یا خوں چکاں باب ہے، درخشاں اس طور پر ہے کہ قابض و غاصب انگریز حکمرانوں کے خلاف لاکھوں ہندستانی سر بکف ہو کر میدانِ جنگ میں نکل آئے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے انگریزوں کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اور خوں چکاں باب اس طرح ہے کہ کئی لاکھ ہندستانی عوام انگریزوں کی وحشیانہ جارحیت اور درندگی کا شکار ہو کر اپنے جان و مال سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اپنے وطن میں رہ کر بھی انھیں بے وطن کر دیا گیا اور ان کی مذہبی و قومی غیرت و حمیت اور عزت و آبرو ہر چیز کو

بر سر عام رسوا اور ذلیل و خوار کر دیا گیا۔

جب انقلاب کا طوفان تھما اور حالات رفتہ رفتہ اعتدال پر آنے لگے تو اہلِ ہند کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ وہ اپنے ایمان، اپنی تہذیب اور اپنی شناخت کے ساتھ کس طرح اپنی زندگی کے ایام پورے کریں؟ کس طرح اپنی زمین اور جائداد کا تحفظ کریں اور اپنی معاشی ابتری اور بدحالی پر قابو پائیں؟ رہ گئی بات داستانِ انقلاب و مصائبِ انقلاب کو تاریخی ریکارڈ کے طور پر ضبطِ تحریر میں لانے اور آنے والی نسل کو اس سے واقف و باخبر رکھنے کی تو اس کا کسے ہوش تھا اور کسے اتنی جرأت تھی کہ صحیح واقعات انقلاب سپرد قلم کر کے انگریزی مظالم اور چیرہ دستیوں کو دعوت دے؟ تقریباً ساٹھ ستر سال تک یہی حالات رہے اور خونی نقوش ایک ایک کر کے مدھم اور محو ہوتے چلے گئے۔ انقلاب 1857ء کی عام تاریخ کا یہی حشر ہوا تاہم موجودہ ہند و پاک کے موجودہ محافظ خانوں اور نیشنل لائبریریوں میں منتشر طور پر ایسے ہزاروں صفحات اب بھی محفوظ و موجود ہیں جو گردشِ ایام پر ماتم کر رہے ہیں اور اب تک ان اوراق و صفحات کا مطالعہ کر کے ایسے دفینوں اور خزینوں کو منظرِ عام پر لانے کی کسی محقق و مورخ کو توفیق نہ مل سکی، جو ہماری قومی و ملکی تاریخ کا گراں قدر سرمایہ اور بیش بہا اثاثہ ہیں۔

یہ حقیقت تاریخی شہادتوں سے ثابت اور واضح ہے کہ انگریزی پنجۂ استبداد سے اپنے ملک و وطن کو نجات اور آزادی دلانے میں علماے کرام اور مسلمانانِ ہند ہی پیش پیش رہے ہیں، جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے ہندستان کی سلطنت و حکومت چھینی تھی اور وہی زندگی کے ہر میدان میں انگریزی ظلم و جبر کا شب و روز نشانہ بھی بن رہے تھے اور منظم طور پر ہر شعبۂ زندگی میں انھیں بے اثر بلکہ پس ماندہ بنانے کی مسلسل کوشش کی جاتی رہی۔ ایسے حالات میں فطری طور پر مسلمان مضطرب اور مشتعل ہوتے رہے، جس کا نتیجہ انقلاب 1857ء کی شکل میں ظاہر ہوا۔

تحریری طور پر انقلاب کے منتشر حالات و واقعات کی تحقیق و ترتیب کی طرف مورخین نے کما حقہ نہ پہلے توجہ دی، نہ ہی اس وقت ان کی خاطر خواہ توجہ ہے۔ قائدین انقلاب مثلاً مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، علامہ فضل حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا سید کفایت علی کافی مراد آبادی، مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی، مفتی مظہر کریم دریا آبادی وغیرہم نیز جنرل بخت خاں و شاہ زادہ فیروز شاہ وغیرہ کی انگریز مخالف سرگرمیوں اور قربانیوں کی تفصیلات سے آج بھی اہلِ وطن بڑی حد تک ناواقف ہیں، بلکہ کئی ایک ناموں سے ان کے کان بھی نا آشنا ہیں۔ بادشاہ ہونے کی وجہ سے آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر کا نام ضرور مشہور ہے، مگر عام طور پر سرکاری ذرائع ابلاغ ان کا ذکر بھی رسمی طور پر ہی کرتے ہیں۔

انقلاب 1857ء میں کہیں کہیں ہندوؤں کی شرکت کے باوجود عام طور پر قومی حیثیت سے ہندوؤں کے اندر وہ جوش و جذبہ مفقود تھا جس کی چنگاریاں مسلمانوں کے دلوں میں بھڑک رہی تھیں اور جگہ جگہ وہ انگریزی سامراج سے ٹکر لے رہے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے ہندو مورخین کو تاریخ انقلاب سے وہ دل چسپی نہیں جو ہونی چاہیے۔ اسی طرح کمیونسٹ مورخین اس انقلاب کو محض معاشی بے چینی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور وہ اس کی پوری تاریخ کو اپنے ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتے اور بیان کرتے ہیں اور علما کے ذکر سے وہ دانستہ اعراض کرتے ہیں۔

اپنی تاریخ کو مدون و مرتب کرنا ہر قوم و ملت کا خود اپنا فریضہ ہے جس سے غفلت و تکاسل، اس کی بے شعوری و بے عملی و نا اہلی خیال کی جاتی ہے۔ دوسروں سے ایسی توقع اور اس پر انحصار فضول و عبث ہے کہ وہ آپ کی خدمات اور فضائل و کمالات کی تفصیلات بیان کریں اور آپ کے فائدے کے لیے کد و کاوش اور جاں سوزی کر کے آپ کی تاریخ مرتب کریں۔ ایسی صورت میں دوسروں کا شکوہ نہیں بلکہ اپنے اوپر جتنا بھی ماتم کیا جائے وہ کم ہے اور صحیح معنوں میں یہ ماتم کا نہیں بلکہ اپنی فکر و تحقیق اور زبان و قلم کو مہمیز لگانے کا مقام ہے اور زندہ قوم کی یہی علامت ہے کہ اپنے ماضی کی تاریخ خود اپنے قلم سے رقم کرے اور حال کی اصلاح کے ساتھ اپنے مستقبل کو روشن و تابناک بنائے۔

محض یہ نالہ و شیون اور آہ و فغاں کرنے کا کچھ حاصل نہیں کہ دوسروں نے ہمارے ساتھ متعصبانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے ہماری تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ کمالِ مردانگی یہ ہے کہ خود اپنے اندر ایسی طاقت و توانائی پیدا کی جائے کہ رحم طلب نظروں سے کسی

دوسرے کی طرف دیکھنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آئے اور کسی دوسرے کے اندر یہ جرأت ہی پیدا نہ ہو سکے کہ وہ متعصبانہ رویے کا ارتکاب اور اس کا اظہار کر سکے۔

انقلاب 1857ء میں نمایاں کردار ادا کرنے والے علماے کرام سنی حنفی تھے جن میں سے بعض کے اسماے گرامی گزشتہ سطور میں درج کیے جا چکے ہیں۔ ان میں کوئی بھی وہابی نہیں تھا، نہ غیر مقلد نہ دیوبندی۔ غیر مقلدیت و دیوبندیت کی تخم ریزی شاہ محمد اسماعیل دہلوی (متوفی 1831ء) کی رسوائے زمانہ کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے ذریعہ ہوئی اور اس منحوس کتاب نے ہندستان کے سنی مسلمانوں کے گھر گھر میں افتراق و انتشار کی آگ لگا دی، جس کے شعلے آج بھی ہندو پاک و بنگلہ دیش کی مسلم آبادیوں میں بلند ہو رہے ہیں۔ اس کتاب کو انگریزوں نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے انگریزی زبان میں شائع کیا اور اس کے انگریزی و اردو نسخے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم کیے اور وہابیت کو گھر گھر پہنچانے کی کوشش کی۔ اس وہابیت کے مقلد گروہ کا نام دیوبندیت اور غیر مقلد گروپ کا نام اہلِ حدیث یا غیر مقلد ہے۔

مشہور غیر مقلد محدث میاں نذیر حسین دہلوی اور ان کے شاگرد خاص محمد حسین بٹالوی انگریزوں کے معتمد خاص تھے جو انقلاب 1857ء میں شریک علما کو جاہل اور مفسد سمجھتے تھے۔ مولانا سید محمد میاں دیوبندی و مولانا مسعود عالم ندوی اور ڈاکٹر قیام الدین وغیرہ نے صراحتاً اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ سید احمد رائے بریلوی اور شاہ محمد اسماعیل دہلوی سے وابستہ جماعت نے بہ حیثیت جماعت انقلاب 1857ء میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ موخر الذکر دونوں حضرات نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ اس انقلاب کو مذہبی اعتبار سے یہ جماعت ناپسند کرتی تھی۔ (ملاحظہ کیجیے ہندستان میں پہلی اسلامی تحریک، از: مسعود عالم ندوی، علماے ہند کا شان دار ماضی، از: سید محمد میاں دیوبندی، وہابی تحریک از: ڈاکٹر قیام الدین احمد، پٹنہ)

دیوبند، سہارن پور کے اندر 1283ھ مطابق 1866ء میں حاجی سید عابد حسین قادری چشتی نے ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا جس پر آٹھ نو سال بعد مولانا محمد قاسم نانوتوی قابض ہو گئے اور دار العلوم دیوبند کے نام سے وہ مدرسہ ان کی کوششوں سے مشہور ہوا۔ جس طرح یہ دعویٰ تاریخی کذب بیانی ہے کہ مولانا قاسم نانوتوی مدرسہ دیوبند کے بانی ہیں اسی طرح یہ دعویٰ بھی کذب بیانی کا ایک عبرت ناک نمونہ ہے کہ علماے دیوبند نے انقلاب 1857ء میں کوئی حصہ لیا۔ اس دعویٰ کی تکذیب و تردید کی مندرجہ ذیل بنیادیں ہیں:

1- 1857ء کے آٹھ نو سال بعد مدرسہ دیوبند کی بنیاد پڑی تو ایسی صورت میں یہ کہنا کہ علماے دیوبند نے جنگ آزادی 1857ء میں شرکت کی تھی، اسے کذب بیانی اور سفید جھوٹ کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

2- ایک مڈبھیڑ جس میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، متوطن تھانہ بھون، حافظ ضامن جلال آبادی و رشید احمد گنگوہی و محمد قاسم نانوتوی میں سے کوئی بھی دیوبند کا باشندہ نہیں تھا کہ اسے 1857ء یا 1866ء میں علماے دیوبند کہا جا سکے۔

3- اس دور میں دیوبندیت کے نام سے کسی مسلکی و مذہبی گروہ کا وجود بھی نہیں تھا کہ یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ اکابر دیوبندیت یا اکابر علماے دیوبند انقلاب 1857ء میں شریک تھے۔ جس مڈبھیڑ کا ذکر علماے دیوبند کرتے ہیں اور شاملی کی جھڑپ سے جس کا رشتہ جوڑتے ہیں وہ مڈبھیڑ شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کی تحقیق کے مطابق ایسے آوارہ گرد لوگوں کے ساتھ ہوئی تھی جو نہ انگریز حامی، نہ انگریز مخالف کی حیثیت سے متعارف تھے بلکہ حالات کی سنگینی کا فائدہ اٹھا کر لوٹ مار کرنا جن کا مقصد اور مطمحِ نظر تھا۔

4- جنگ شاملی قاضی عنایت علی اور ان کے زیر اثر مسلمانوں نے لڑی جس میں مذکورہ حضرات کی شرکت کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔

5- شاملی، مظفر نگر، سہارن پور کے سرکاری تاریخی ریکارڈ میں مذکورہ علما میں سے کسی کے بارے میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ کسی انگریز حامی گروپ سے ان کی کوئی جھڑپ ہوئی ہو۔

6- 1857ء کے کسی ہندستانی یا انگریز مورخ نے اپنی کسی چھوٹی بڑی تحریر میں باغی اور مجاہد کی حیثیت سے مذکورہ علما میں سے کسی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

7- 1947ء سے چند سال پہلے یا 1950/1955ء کے آس پاس بلا ثبوت و سند کے یہ تاریخ گڑھنے کی کوشش کی گئی کہ علماے دیوبند جنگ آزادی 1857ء میں شریک تھے۔

8- سرکاری خوش نودی حاصل کرنے یا کسی رنجش کی بنا پر جس طرح اس زمانے میں عام طور پر کوئی بھی مخبر کسی بھی شخص کے خلاف کوئی جھوٹی خبر دے کر اسے گرفتار کرا دیتا اور پھر اسے کوئی سزا ہو جایا کرتی تھی۔ اسی طرح کی مخبری مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلاف بھی کسی نے کی جس کا اعتراف و اعلان مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں کیا ہے۔

غیر مقلدوں اور دیوبندیوں کے پیشوا سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی بالاکوٹ میں 1831ء میں قبائلی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ ان دونوں نے نہ صرف یہ کہ انگریزوں کے خلاف کوئی فتویٰ دینے یا ان سے کوئی جنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ تحریراً و تقریراً انگریزوں کی خوش نودی حاصل کرنے کی کوشش کی اور انگریزوں کے دشمن سکھوں اور افغانی مسلمانوں سے جنگ کی۔ کوئی معمولی سے معمولی روایت کسی بھی مورخ کی ایسی نہیں جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ انھوں نے انگریزوں سے کسی طرح کی جھڑپ کی ہو اور ان کے خلاف کسی طرح کا کوئی پروپیگنڈہ کیا ہو، یا ایسا کوئی اقدام کیا ہو جس کی بنیاد پر انھیں انگریز مخالف کہا جا سکے خود ان کے حامی علما و مورخین لکھتے ہیں کہ ہندستان سے سرحد کی طرف پیش قدمی کے وقت انگریزوں نے مختلف حیلوں اور تدبیروں سے ان کی مدد کی اور حوصلہ افزائی کی۔

(ملاحظہ کیجیے، سوانح احمدی و حیات عجیبہ وغیرہ)

تاریخ ذکاء اللہ کے مطابق علامہ فضل حق خیر آبادی نے شاہ جہانی جامع مسجد دہلی میں جب انگریزوں کے خلاف تقریر کی اور پھر جہاد کا فتویٰ جاری کیا تو دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی۔ اسی طرح جہاد کا ایک اور فتویٰ جاری ہوا جس پر مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی کا بھی دستخط تھا۔ مولانا سید کفایت علی کافی مراد آبادی نے مراد آباد میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور آس پاس کی مختلف جگہوں میں اسے مشتہر کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ بدایوں میں مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی نے جہاد کے لیے علما کا بیان جاری کیا۔ متعدد مقامات پر اپنے اپنے طور پر علما نے انگریزوں کے خلاف جہاد کی ترغیب و تحریک کی اور یہ سب کے سب علماے اہلِ سنت تھے اور سوادِ اعظم اہلِ سنت کی قیادت و رہ نمائی انھیں علماے اہل سنت نے کی۔ (تفصیل و تحقیق کے لیے ملاحظہ کیجیے، 1857ء پس منظر و پیش منظر، از: یٰسین اختر مصباحی، مطبوعہ دار القلم ذاکر نگر، نئی دہلی 25)

مسلم مجاہدینِ آزادی کے ساتھ جو متعصبانہ رویہ اختیار کیا گیا، اس کے خلاف ہمارے علمانے کچھ نہیں کیا

علماے دیوبند کا جنگ آزادی میں حصہ دال میں نمک کے برابر رہا

از: پروفیسر غلام یحییٰ انجم، صدر شعبۂ علوم اسلامیہ، ہمدرد یونیورسٹی، نئی دہلی

انقلاب 1857ء کے تعلق سے علماے اہلِ سنت کا کردار بلاشبہہ قابلِ تقلید رہا، انھیں حضرات کی کاوشوں کا ثمرہ ہے کہ ہم آج ہندستان کی کھلی فضا میں سانس لے رہے ہیں، مگر جن ہاتھوں میں قلم تھا ان کا تعلق علماے اہلِ سنت کے مخالف گروہ سے تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے آبا و اجداد اور اپنے اکابر کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر ایسا پیش کیا کہ جنگ آزادی کے اصل ہیرو ہی بن گئے اور سنی چوں کہ قلمی اعتبار سے مفلوج تھے اس لیے وہ اپنی سچی تاریخ بھی اہلِ دانش کے سامنے نہ پیش کر سکے، جس کے نقصانات کس قدر ہوئے، وہ آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ میں مبارک باد دیتا ہوں ماہ نامہ اشرفیہ کے مدیر مولانا مبارک حسین مصباحی کو کہ انھوں نے انقلاب 1857ء کو موضوعِ بحث بنا کر صاحبانِ فکر و نظر اور اربابِ دین و دانش کے خیالات کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ اس تعلق سے مدیر ماہ نامہ نے انقلاب 1857ء سے متعلق جو سوالات مجھ سے کیے ہیں، ان کے جوابات کچھ اس طرح ہیں:

1- ہندستان بلاشبہہ ایک جمہوری ملک ہے، اس کی آزادی کے تعلق سے اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی آزادی میں ہندو و مسلم برابر کے شریک ہیں مگر اس سلسلے میں میرا مطالعہ قدرے مختلف ہے اور وہ یہ کہ غدر کے واقعات سے جہاں دلی کے مسلمانوں میں تباہی و بربادی پھیلی ہوئی تھی، وہیں دوسرے برادرانِ وطن مطمئن تھے۔ ان کے ذہن و دماغ میں کسی قسم کا انتشار نہ تھا۔ مولوی ذکاء اللہ اپنی تصنیف

''تاریخ انگلیسیہ'' میں لکھتے ہیں:

''جن محلوں میں غدر سے پہلے ہندوؤں کی ملک میں ایک مکان نہ تھا، غدر کے بعد وہاں بہت سے ہندو مالک مکان ہو گئے۔ مسلمانوں نے اپنا زیور بہت سستا ہندوؤں کے ہاتھ بیچا۔ بارہ آنے تولہ چاندی، چودہ روپے تولہ سونا۔ بہت سے ہندوؤں کے گھروں میں غدر کیا آیا، لکشمی آئی۔ انھوں نے سپاہیوں سے لوٹ یا چوری کا مال ارزاں خرید لیا۔''

(ذکاء اللہ، تاریخ انگلیسیہ، ص:719)

یہ وہ حقائق ہیں، جنھیں نہ تو کوئی بیان کرتا ہے اور نہ ہی انھیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملکی قیادت آزادی کے بعد مسلسل انھیں برادرانِ وطن کے ہاتھوں میں رہی، اس لیے انھوں نے مسلم مجاہدین جنگ آزادی کے تعلق سے کاوشوں کو پس پشت ڈال دیا اور خود ہی جنگ آزادی کے ہیرو بن بیٹھے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح دیوبندی مورخین نے علماے اہلِ سنت کی مجاہدانہ کاوشوں کو غدر کے صفحۂ تاریخ سے مٹا دیا اور خود جنگ آزادی کے ہیرو بن گئے۔ ایسا ایک گہری سازش کے تحت کیا گیا ہے، جس کے جاننے کے لیے ہندو متعصبانہ ذہنیت کا مطالعہ تاریخِ ہند کے حوالے سے مناسب ہوگا۔ جنگ آزادی کے تعلق سے آپ نے مسلمانوں کی بے حسی کی طرف جو اشارہ کیا ہے وہ بھی اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ ہمیں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچنا چاہیے۔

2- مسلم مجاہدین آزادی کے ساتھ برادرانِ وطن نے جو متعصبانہ رویہ اختیار کیا، اس کے خلاف ہمارے علما نے کچھ نہیں کیا۔ ان حضرات کے نوکِ قلم سے ایسی کوئی پالیسی وضع نہیں ہوئی جس کے باعث مکمل طور پر اس گھناؤنی حرکت پر قدغن لگایا جا سکے۔ اس سلسلے میں مسلم علما وقائدین کو چاہیے کہ مسلم مجاہدین آزادی کے تعلق سے سمینار اور کانفرنسیں کریں اور اس میں عمائدین مملکت اور حکومت کے اہم ذمہ داران کو بلا کر ان کی قربانیوں کا ذکر کریں۔ اردو زبان کے علاوہ ہندی اور انگریزی زبان میں ان مسلم مجاہدین اور ان کی مجاہدانہ قربانیوں کے تعلق سے تفصیل سے لکھیں۔

3- جیسا کہ راقم السطور نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے کہ قلم کی طاقت اغیار کے پاس تھی، انھوں نے جنگ آزادی کی ایسی تاریخ گڑھی جس کا حقائق سے دور کا واسطہ نہیں۔ انھوں نے جس کو چاہا جنگ آزادی کا ہیرو بنا دیا اور جس کو چاہا صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ حقائق سے یہ واضح ہے کہ وہابی علما نے جنگ آزادی کی مخالفت کی اور علماے دیوبند کا جنگ آزادی میں حصہ دال میں نمک کے برابر رہا، مگر آزادی پر قلم اٹھانے والوں نے اس تاریخ کو ایسا پیش کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اور صرف علماے دیوبند ہی کی مجاہدانہ کاوشوں سے ہمیں ہندستان کی آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ تاریخ کو گڈمڈ کرنے اور جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے میں ہمارے بعض مورخین جس میں غلام رسول مہر کا نام سرفہرست ہے، کلیدی کردار رہا ہے۔ انھوں نے اپنی تاریخ نگاری میں جنگ آزادی کی پوری تاریخ مسخ کر کے رکھ دی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض سیدھے سچے لوگوں نے بھی ان کی گم راہ کن تحریروں کو اصل سمجھ لیا ہے۔ اس تعلق سے ایک واقعہ جو حقیقت پر مبنی ہے، یہاں لکھنا ضروری سمجھتا ہوں، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایسے مورخین کی تحریروں سے سیدھے سچے لوگ کس قدر گم راہ ہوئے ہیں۔

جنگ آزادی کے تعلق سے میرا ایک مقالہ ''ایوان اردو'' دہلی میں 2007ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ مقالہ میں انھیں حقائق کی نشان دہی کی گئی تھی جنھیں مسلسل نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ مقالہ چھپتے ہی ایک خود ساختہ دانش ور نے اس پر اعتراض کر ڈالا۔ معترض اور اس کے اعتراض کا راقم نے جو جواب دیا وہ دونوں ہدیۂ ناظرین ہیں:

مکتوب اطہر نقوی، جامعہ نگر، نئی دہلی

بخدمت مدیر ایوان اردو، دہلی

مکرمی:

تحریکِ آزادی سے متعلق ایک غلط فہمی یہ ہے کہ 1857ء کو پہلی جنگ آزادی قرار دیا جاتا ہے، جب کہ برٹش سامراج کے خلاف پہلی مسلح جدوجہد 1826ء میں شروع ہوئی۔ وہابی تحریکِ جہاد کے اس اولین معرکہ کے سالار شاہ محمد اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی تھے۔ 6/مئی 1831ء کو بالا کوٹ کے میدان میں شہید ہوئے۔ 1857ء کا معرکہ دوسری جنگ تھی۔ تیسرا معرکہ 1942ء کو نیتا جی سباش چندر بوس نے آزاد ہند فوج کی تشکیل کر کے شروع

کیا۔ اس طرح جنگ آزادی کے یہ تین مرحلے تھے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

غلام یحییٰ انجم کا مضمون ''دہلی کے علما اور 1857ء'' غیر مستند حوالوں پر مبنی ہے اور قابلِ اعتراض بلکہ اشتعال انگیز ہے۔ انھوں نے شاہ محمد اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی کو جنگ آزادی کا مخالف قرار دیا ہے۔ حالاں کہ یہ دونوں جنگ آزادی کے اولین سالاروں میں سے تھے۔ دونوں 1831ء میں شہید ہوئے، اس لیے یہ کہنا کہ جنگ آزادی کے مخالف تھے، محض تعصب اور بدنیتی پر مبنی ہے۔ دہلی میں تحریکِ آزادی 1857ء میں شروع ہوئی، جب کہ یہ دونوں 25رسال پہلے اس دنیا سے جا چکے تھے۔

انجم صاحب اگر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب ''ہمارے ہندستانی مسلمان (1870)''، ڈاکٹر قیام الدین کی کتاب ''ہندستان میں تحریکِ وہابیت'' اور مولانا غلام رسول مہر کی قاموسی تحریر ''تحریکِ مجاہدین، سرگشتِ مجاہدین اور سید احمد شہید'' کا بغور مطالعہ کریں تو انھیں معلوم ہوگا کہ وہابی ہندستان کی جنگ آزادی کے اولین نقیب اور مجاہد تھے۔

اطہر نقوی، جامعہ نگر، دہلی

جنگ آزادی کے تعلق سے اطہر نقوی صاحب کے مکتوب کا جواب:

پروفیسر قمر رئیس صاحب، وائس چیرمین اردو اکیڈمی اور مدیر اعلیٰ صاحب ماہ نامہ ''ایوانِ اردو''، دہلی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جنابِ عالی!

آزادی کے ساٹھ سال پورے ہونے پر ملک ہندستان میں متعدد تقریبات کا اہتمام کیا گیا، کلچرل پروگرام کے علاوہ جنگ آزادی کے تعلق سے کئی ایک کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔ کئی دینی وادبی رسالوں میں جنگ آزادی کے تعلق سے مضامین شائع ہوئے، اس تعلق سے راقم کا بھی ایک مقالہ ''دہلی کے علما اور 1857ء'' اردو اکیڈمی کے موقر رسالہ ایوانِ اردو دہلی میں شائع ہوا۔ اس مقالہ میں ان حقائق کی نشان دہی کی گئی تھی، جس کی طرف سے مسلسل اغماض برتا جا رہا تھا۔ یہ حقائق چوں کہ چونکا دینے والے تھے، اس لیے کچھ لوگوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ اطہر نقوی صاحب نے اس سلسلے میں راقم سے رابطہ قائم کرنے کے بجائے ایوانِ اردو کے مدیر یعنی آپ کو ایک جذباتی خط بھی لکھ مارا، جس میں انھوں نے لکھا:

''غلام یحییٰ انجم کا مضمون ''دہلی کے علما اور 1857ء'' غیر مستند حوالوں پر مبنی ہے اور قابلِ اعتراض بلکہ اشتعال انگیز ہے۔ انھوں نے شاہ محمد اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی کو جنگ آزادی کا مخالف قرار دیا ہے۔ حالاں کہ یہ دونوں جنگ آزادی کے اولین سالاروں میں سے تھے۔'' (مکتوب اگست 2007ء)

اپنے خط میں انھوں نے درج ذیل تین چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔

(1) پہلی جنگ آزادی 1857ء نہیں 1826ء ہے۔

(2) شاہ اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی جنگ آزادی کے اولین سالاروں میں سے تھے۔

(3) اس سلسلے میں اصل حقائق جاننے کے لیے راقم کو ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اور مولانا غلام رسول کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اطہر نقوی صاحب نے پہلی جنگ آزادی 1826ء کو جنگ آزادی قرار دیا ہے، جو محلِ نظر ہے۔ ابھی جو تقریبات منائی گئی ہیں تمام حلقہ والوں نے ہی 1857ء کو ہی پہلی جنگ آزادی قرار دیا ہے۔ جنگ آزادی کی مہم کبھی بھی چھڑی ہو لیکن اس جنگ نے باضابطہ جنگ کی شکل اس وقت اختیار کی جب علما نے فتویٰ جہاد صادر فرمایا اور پھر جوق در جوق علما اس مہم میں شریک ہوئے، اور ایسا 1857ء میں ہوا، جس کی تفصیل اس دور میں لکھی جانے والی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اطہر نقوی صاحب نے اپنے مکتوب میں جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ شاہ اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی جنگ آزادی کے اولین سالاروں میں تھے، یہ بھی محلِ نظر ہے۔ کیوں کہ ان کے دونوں سوانح نگار مولانا جعفر تھانیسری اور مرزا حیرت دہلوی ان کے نہایت ہی اہم اور قریب العہد سوانح نگار ہیں۔ ان کے سوانح نگاروں کی تحریروں کی صداقت اور حقانیت کا اعتراف مسعود عالم ندوی، حسین احمد مدنی اور دورِ آخر میں ابوالحسن علی ندوی جیسے صاحبانِ فکر ونظر نے کیا ہے۔ یہ دونوں مصنفین ببانگ دہل اس کا اقرار کرتے ہیں کہ سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی نے انگریزوں سے نہیں سکھوں سے جہاد کیا تھا اور اسی میں ان کی موت ہوئی تھی۔ یہ دونوں مصنفین شاہ اسماعیل

دہلوی، جو سید صاحب کے ہم پیالہ و ہم نوالہ بھی تھے، سید احمد رائے بریلوی کی اتباع میں انگریزوں سے کیسی محبت کرتے تھے، مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں:

''یہ صحیح روایت ہے کہ اثنائے قیام کلکتہ میں جب ایک روز مولانا محمد اسماعیل دہلوی وعظ فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے مولانا سے یہ فتویٰ پوچھا کہ سرکار انگریز سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں، اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ بے رو ریا اور غیر متعصب سرکار پر کسی بھی طرح جہاد کرنا درست نہیں۔''

(سوانح احمدی، ص:171)

مرزا حیرت دہلوی نے بھی اپنی تصنیف میں یہ بات تحریر کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''کلکتہ میں جب مولانا اسماعیل دہلوی نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا ہے اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی ہے تو ایک شخص نے دریافت کیا کہ آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے۔ آپ نے جواب دیا، ان پر جہاد کرنا کسی طرح واجب نہیں، ایک تو ان کی رعیت ہیں، دوسرے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے، بلکہ ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔'' (حیات طیبہ، ص:423)

سید احمد رائے بریلوی نے انگریزوں کی ایما و اشارہ سے سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری کی اور اس جنگ میں انگریزوں نے اس کی مدد کی، سکھوں سے اس جہاد کو وہ اپنے لیے مامور من اللہ سمجھتے تھے۔ اپنے ایک مکتوب میں سید صاحب لکھتے ہیں:

''معاملہ ایں خاک سار کالشمس فی رابعۃ النہار ہویدا و آشکار است کہ جہادِ اہلِ عناد قوم سکھ ماموررم۔''

(مکتوب احمدی، ص:236)

(اس خاک سار کا معاملہ سہ پہر کے سورج کی طرح واضح ہے کہ میں اہلِ عناد قوم سکھ سے جہاد کے لیے مامور ہوں۔)

اس کے علاوہ سید صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے سکھوں سے جہاد کرنے کے لیے اللہ کی طرف سے الہام بھی ہوا ہے، فرماتے ہیں:

''اما بیان الہام پس از فقیر از پردۂ غیب بہ بشارت ربانی باستیصال کفارِ درازمویاں مراد است۔''

(مکتوب احمدی، ص:180)

سید صاحب کا الہام بتا رہا ہے کہ وہ کفارِ درازمویاں یعنی سکھوں کے استیصال کے لیے مامور تھے۔ مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں:

''سفر جہاد سے پہلے آپ کو یہ الہامِ ربانی ہوا تھا کہ ملک پنجاب آپ کے ہاتھوں فتح ہو کر پشاور سے دریائے ستلج تک مثل ملک ہندستان کے رشک افزائے چمن ہو جائے گا۔ چناں چہ ان متواتر وعدہ ہائے فتح سے آپ کا ہر ایک مرید واقف تھا۔'' (سوانح احمدی، ص:172)

آپ کے سوانح نگار دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''ان حالات کی موجودگی میں کہ انگریز سرکار کارفرما تھی مگر اس کی مسلمان رعایا کی آزادی اور سرکار انگریز کی بے روریائی اور ان حالات کی موجودگی میں ہماری شریعت کی شرائط سرکار انگریزی سے جہاد کو مانع تھیں، اس لیے آپ نے فیصلہ فرمایا کہ سکھ قوم پنجاب پر جو نہایت ظالم اور احکاماتِ شریعت کی حارج اور مانع تھی، جہاد کیا جائے۔'' (سوانح احمدی، ص:125)

ان تفصیلات کی روشنی میں جناب اطہر نقوی صاحب دین و دیانت کی روشنی میں بتائیں، جو ان کے قریب العہد سوانح نگار لکھ رہے ہیں، اُسے مانا جائے یا سوا سو سال بعد جو غلام رسول مہر لکھ رہے ہیں اسے تسلیم کیا جائے۔ اطہر نقوی صاحب ذرا گریبان میں اپنا سر ڈال کر سوچیں کہ سید صاحب کو الہام ہوتا رہا کہ آپ سکھوں کے خلاف جہاد کریں، سوا سو سال تک لوگ یہی کہتے رہے، لیکن ایک سو پچیس سال بعد غلام رسول مہر کو الہام ہوا کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف تھے اور ان سے جہاد کرنا چاہیے تھا، اگرچہ انگریز حکومت کی مخالفت میں ان سے ایک حرف بھی منقول نہیں۔ کہاں تک مبنی بر صداقت ہے۔ کیا یہ سوچ ایک مخصوص مکتب فکر کی ترجمانی نہیں کرتی؟

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسماعیل شہید جیسے لوگ سر سے کفن باندھ کر لوگوں کو سکھوں کے عذاب سے نجات دلانے آئے تھے، اور مسلمانوں کے ہی ہاتھوں شہید ہو کر خالقِ حقیقی سے جا ملے اور ان مارے جانے والوں میں ان کے ساتھ اور بھی لوگ تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں:

''1831ء میں بالاکوٹ کے مقام پر حضرت سید احمد شہید اور ان کے ساتھی شہید کر دیے گئے اور خود آزاد قبائل میں سے بعض لوگوں نے ہندستانی مجاہدین کو لوٹا کھسوٹا اور قتل تک کیا۔''

(مقدمہ کابل میں سات سال، ص:16)

اس حقیقت کا اعتراف سر سید نے بھی کیا ہے کہ اسماعیل دہلوی اور سید احمد کی شہادت مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ وہ فرماتے ہیں:

''ہندستان کے شمال و مغرب کی سرحد پر جو پہاڑی قومیں رہتی ہیں، وہ سنی المذاہب قومیں ہیں۔ چوں کہ پہاڑی قومیں ان (سید احمد و اسماعیل دہلوی) کے عقائد کے مخالف تھیں، اس لیے وہ وہابی ان پہاڑیوں کو ہرگز اس بات پر راضی نہ کر سکے کہ وہ ان کے مسائل کو بھی وہ اچھا سمجھتے مگر البتہ چوں کہ سکھوں کے جور و ستم سے نہایت تنگ تھے، اس سبب سے وہ وہابیوں کے اس منصوبے میں شریک ہو گئے کہ سکھوں پر حملہ کیا جائے .... لیکن چوں کہ یہ قوم مذہبی مخالفت میں نہایت سخت ہے، اس سبب سے اس قوم نے اخیر میں وہابیوں سے دغا کر کے سکھوں سے اتفاق کر لیا اور مولوی محمد اسماعیل صاحب و سید احمد کو شہید کر دیا۔'' (مقالات سرسید، نہم، ص:39-40)

یہ ہے وہ اصل حقیقت جس پر غلام رسول مہر نے پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی ہے اور عام سوانح نگاروں سے ہٹ کر ملتِ اسلامیہ کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور بہ بانگ دہل اس بات کا اقرار کیا ہے کہ:

''میں مجاہدین کی شان و آبرو بہ ہر حال قائم رکھنے کا قائل ہوں اگرچہ وہ سابقہ بیانات اور توجیہات سے عین مطابق نہ ہوں۔'' (افادات مہر، ص:231)

انگریز مصنف ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی جس کتاب کے مطالعہ کا اطہر نقوی صاحب نے مجھے مشورہ دیا ہے، اس کتاب کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:

''ان کی ابتدائے تحریر سے یہ بات صاف مترشح ہو جاتی ہے کہ وہ جس طرح ان سے ہو سکے گا مسلمانوں کو باغی بنانے اور گورنمنٹ کو ان کی طرف سے بدظن کرنے کی کوشش کریں گے۔ چناں چہ ختم کتاب تک انھوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ ان کی 218 صفحے کی کتاب غلطیوں کے انبار سے بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح بے جا تحکم اور غلط منطق کی ہر جگہ جھلکی پائی جاتی ہے۔ کاش اگر کچھ بھی انصاف ہوتا تو وہ مظلوم مسلمانوں کو ایسا متہم نہ کرتے۔'' (حیات طیبہ، ص:422)

اطہر نقوی صاحب ایسے مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا مشورہ مجھے کیوں دے رہے ہیں، بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

(غلام یحییٰ انجم)

ان تفصیلات کی روشنی میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ علمائے اہلِ سنت کے قلم کی کوتاہی سے کہیں زیادہ دیوبندی علما اور دانش وروں کے نظریاتی تعصب کا کافی عمل دخل رہا ہے۔

4- دیوبندیت کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، اس مکتبِ فکر کے موسسین میں سے تھے۔ جو لوگ اس کا ڈانڈا حضرت شاہ ولی محدث دہلوی سے جوڑتے ہیں وہ تاریخی اعتبار سے غلطی پر ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا انظر شاہ کشمیری (وفات، مئی 2008ء) استاذ تفسیر دار العلوم دیوبند کا بیان قولِ فیصل ہوگا۔ وہ اپنے ایک مقالہ ''مسلک دیوبند کیا ہے؟'' میں لکھتے ہیں:

''مسلکِ دیوبند چودھویں صدی کی پیداوار ہے۔ مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی سے پہلے کسی مسلمہ شخصیت سے اس مسلک کا کوئی تعلق نہیں۔''

پھر وہ لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک دیوبندیت خالص ولی اللہی فکر بھی نہیں اور کسی خاص خانوادہ کی لگی بندھی فکرِ دولت و

متاع، میرا یقین ہے کہ اکابر دیوبند جن کی ابتدا میرے خیال میں سیدنا الامام مولانا قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ اور فقیہ اکبر مولانا رشید احمد گنگوہی سے ہے، علمِ کامل اور شعورِ بالغ کے ساتھ قدرت نے ان کو ایک ایسی چھلنی بھی عطا کی تھی جس سے وہ افکار و نظریات کو چھان کر ہی قبول کر سکیں۔ مجھے اس حقیقت کے واشگاف کرنے میں کوئی تامل و تذبذب نہیں ہوتا کہ ہندستان کی سیاسی و مذہبی پامالی کے دور میں دین کو اپنی شکل میں باقی رکھنے کے لیے دیوبند کا وجود قدرت کا ایک عطیہ ہے اور جن اکابر کو فکر و نظر کی تراش و خراش کے لیے خدائے تعالیٰ نے کھڑا کر دیا وہ عظیم الشان صدیوں کی الٹ پھیر میں وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ دیوبندیت کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ سے کرنے کے بجائے مذکورہ بالا دو عظیم ہستیوں سے کرتا ہوں۔"

(البلاغ، کراچی، ص:131 ذی الحجہ 1388ھ)

اکابر دیوبند جن میں مولانا رشید احمد گنگوہی (م 1905ء) اور مولانا محمد قاسم نانوتوی (م 1880ء) کا نام سرفہرست ہے۔ ان میں اول الذکر کی ولادت 1829ء اور موخر الذکر کی پیدائش 1842ء میں ہوئی۔ یعنی 1857ء کے غدر میں ان حضرات کی عمریں علی الترتیب 28/اور 15/سال تھی، جب علمائے اہلِ سنت آزادی کے حصول کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ دینے کے بعد اپنے جسموں کو چیل اور کوؤں کو غذا فراہم کر رہے تھے۔ ان ایام میں یہ دیوبندی اور وہابی علما انگریزوں کی طرف سے دیے جانے والے اعزازات اور انعامات سے سرفراز ہو رہے تھے۔ بقول رئیس احمد جعفری:

"مولوی نذیر حسین صاحب اور مولوی عبدالرب صاحب اور مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب نے غدر میں ایک دو میموں اور بچوں کو اپنے گھر میں چھپایا تھا۔ اس صلے میں انگریزوں نے ان کو انعام دیا تھا اور ان کی خیر خواہی کی قدر کی۔"

(بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، ص:357)

یہ بالکل سچ ہے کہ برطانوی عہد کے انگریز حکمرانوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر بڑی سختی سے عمل کیا۔ اگر وہ اس پالیسی پر عمل نہ کیے ہوتے تو شاید ان کا جنازہ بہت پہلے ہندستان سے نکل گیا ہوتا۔ مگر انھوں نے اس طرح مسلمانوں کی ایک جماعت کو اپنا ہم نوا بنا لیا جو ان کے ہر منصوبے کو عملی جامہ پہنا کر ملت میں انتشار پیدا کرتی رہی۔ مولوی اسماعیل دہلوی ان میں سے ایک تھے۔ انھوں نے "تقویۃ الایمان" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ہندستان میں تفریق بین المسلمین کے لیے خشت اول ثابت ہوئی۔ مسلمانوں کے درمیان شورش پیدا کرنے اور انھیں لڑانے بھڑانے اور شرک خفی کو شرک جلی لکھنے کے خود اقراری مجرم تو خود شاہ اسماعیل دہلوی ہیں۔ انھوں نے ہی تو یہ اقبالِ جرم کیا ہے۔ (انگریز نوازی کی حقیقت، ص:59) اس تعلق سے بہت ساری تفصیلات ہیں مگر تفصیل میں نہ جا کر صرف دار العلوم دیوبند کی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جس کی سرگرمیوں سے انگریز بہت خوش تھے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ دار العلوم دیوبند کے اصل بانی الحاج عابد حسین تھے جو سلسلۂ قادریہ میں میاں راج شاہ سوندھ شریف ہریانہ کے اجلہ خلفا میں سے تھے اور موجودہ زمانے کے علمائے اہلِ سنت و جماعت کی طرح وہ بھی نذر و نیاز اور میلاد و فاتحہ پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ مگر جب سے دار العلوم دیوبند پر مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے احباب کا غاصبانہ قبضہ ہوا اور حاجی عابد حسین ادارہ سے بالکل بے دخل کر دیے گئے، اسی وقت سے ہی ادارے کے مقاصد جو عظمت رسول اور اشاعت دین حق پر مبنی تھے یکسر بدل گئے۔ انگریزوں کے وظیفہ خوار مولوی اس ادارے کے اہم اراکین میں شامل ہو گئے۔ پھر ان حضرات نے اس ادارے کے پلیٹ فارم سے وہی سب کچھ کیا جو انگریز بہادر چاہتے تھے۔ اس ادارے نے ملت کے درمیان انتشار کا جو کھیل کھیلا، وہ انگریز بہادر کے لیے انتہائی مسرت و شادمانی کا سبب بنا۔ دیوبندی مکتب فکر کے مشہور دانش ور پروفیسر محمد ایوب قادری کی زبانی سنیے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اس مدرسہ نے یوماً فیوماً ترقی کی 31/ جنوری 1875ء بروز یک شنبہ لیفٹیننٹ گورنر سر جان اسٹریچی کے اپنے ایک خاص معتمد مسٹر جان پامر نے اس مدرسہ کو دیکھا تو اس نے نہایت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے معائنہ کی چند سطور درج ذیل ہیں:

جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے صرف سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔ جو کام پرنسپل ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپے ماہانہ پر کر رہا ہے۔" (سوانح احسن نانوتوی، ص:217)

مولانا حکیم اختر شاہجہان پوری اس مذکورہ اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"انگریز افسر نے مدرسہ دیوبند کی اور وہاں کے مدرسین کی تعریف کیا، اس وجہ سے کہ وہاں اسلام کی خدمت ہو رہی ہے؟ انگریز خدمتِ اسلام سے خوش ہوتے تھے یا اس کے استحصال میں سکون محسوس کرتے تھے؟" (فیضان امام ربانی، ص:178)

دار العلوم دیوبند پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے بعد اس کے پلیٹ فارم سے دینی خدمات کے نام پر کیا کارنامہ انجام دیا گیا، اس کی تفصیل بھی مختصراً پڑھتے چلیں تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ انگریزی گورنمنٹ کی ملازمت سے سبک دوش پنشن یافتہ "وفادار" افراد اشاعتِ دینِ حق میں کس قدر مخلص تھے؟

(1) 1290ھ/1874ء میں مولوی محمد قاسم نانوتوی صاحب نے اپنی کتاب "تحذیر الناس" میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ختم نبوت کا انکار کیا۔

(2) 1301ھ/1884ء میں مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب نے "امکان کذب باری تعالیٰ" یعنی اللہ تعالیٰ کے جھوٹ بولنے پر قادر ہونے کا فتویٰ دیا۔
(فتاویٰ رشیدیہ، ص:96، مطبوعہ 1987ء، ناشر گلستاں گھر، دیوبند)

(3) 1304ھ/1887ء میں مولوی خلیل احمد امبیٹھوی صاحب نے اپنی کتاب "براہین قاطعہ" میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے علمِ پاک کو شیطان سے کم تر ثابت کیا، جس کی تصدیق مولوی رشید احمد گنگوہی نے بھی کی۔

(4) 1319ھ/1901ء میں مولوی اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنی کتاب "حفظ الایمان" میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم پاک کو پاگل، مجنوں، جانوروں اور چوپایوں جیسی حقیر اور ذلیل مخلوق سے تشبیہ دے کر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے علمِ غیب کی نفی کی۔

(5) 1353ھ/1934ء میں مولوی محمد قاسم نانوتوی صاحب نے اپنی کتاب "تصفیۃ العقائد" میں انبیائے کرام کو مرتکب کذب اور معاصی زدہ ہونا ثابت کیا۔ 1965ء میں مفتی مسعود احمد اور مفتی سید احمد علی سعید صاحبان نے دار الافتا دیوبند سے مذکورہ عقیدے پر کفر کا فتویٰ دیا۔ (ماہ نامہ تجلی، دیوبند، بابت ماہ اپریل 1965ء، ص:65)

الغرض انگریز بہادر کی حکومت کا انحصار ہی انھیں جیسے نام نہاد مسلمانوں کے ذریعہ سماج میں انتشار پیدا کروانے اور پھر اس کی آڑ میں حکومت کرنے پر تھا۔ اس موضوع پر اور دیگر مصنفین اور قلم کاروں نے تفصیل سے لکھا ہے، جس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

5- برطانوی عہد کے وفاداروں میں کئی ایک فرقے تھے، لیکن انگریزوں کی وفاداری میں جن فرقوں نے اہم کردار ادا کیا ان میں درج ذیل مکاتب فکر کے سربراہان کا کلیدی کردار رہا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی، یہ ہندستان کا نامور کذاب اور دجال گزرا ہے۔ اسے برطانوی سامراج کی درپردہ سرپرستی اور پشت پناہی حاصل تھی۔ اس نے انگریزوں کا قرب حاصل کرنے کے لیے 1857ء کے غدر کے موقع پر فریضۂ جہاد ہی کو ساقط کر ڈالا۔ عدم استطاعت اور قدرت کی بنیاد پر عدم فرضیت کی بات اس نے نہیں کی بلکہ یہ کہا اور لکھا کہ اب کبھی بھی کسی مسلمان پر جہاد فرض نہ ہوگا۔ (انگریز نوازی کی حقیقت، ص:61)

مسلکِ دیوبند کے اکثر علما انگریز بہادر کے ملازم اور وظیفہ خوار تھے۔ مدرسہ دیوبند کے ذمہ داروں اور مدرسوں کی اکثریت ایسے بزرگوں پر مشتمل تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پنشنر تھے، جن کے بارے میں گورنمنٹ کو شک و شبہ کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ (حاشیہ سوانح قاسمی، ص:247 مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانی)

مولانا محمد مظہر نانوتوی مدرس آگرہ کالج، مولانا محمد منیر دیوبندی، مدرس بریلی کالج، مولانا محمد احسن نانوتوی مدرس بنارس و بریلی کالج، دیوبندی شیخ الہند مولانا محمود حسن کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی مدرس بریلی کالج تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے اور پنشن تک آپ یوپی کے مختلف اضلاع بالخصوص بجنور میں ڈپٹی انسپکٹر محکمہ تعلیم کے عہدے پر فائز تھے۔ (انگریز نوازی کی حقیقت، ص:74)

وہابی علما بھی انگریزوں کے ہم نوا تھے۔ انھوں نے علی الاعلان انگریزوں کی حمایت کا اعلان کیا تھا اور یہ لکھا کہ برٹش حکومت مٹ جاوے اور یہ امن و امان جو آج حاصل ہے، فساد کے پردے میں جہاد

کا نام لے کر اٹھا دیا جائے، سخت نادانی اور بیوقوفی کی بات ہے۔

(ترجمان السنۃ، نواب صدیق حسن خاں، ص:7، بھوپال 1312ھ)

مولانا محمد حسین بٹالوی جو انگریز حکومت کے بہی خواہ اور وفادار تھے، انھوں نے حکومتِ ہند کو درخواست دی کہ جماعتِ اہلِ حدیث حکومتِ ہند کی مکمل وفادار ہے اور خیر خواہ ہے اس لیے لفظ وہابی کی جگہ لفظ اہل حدیث لکھنے اور سرکاری کاغذات میں اسی طرح اندراج کرنے کا حکم صادر فرمائیں۔ ان کی یہ درخواست تحریری طور پر 19/جنوری 1887ء کو منظور ہوئی اور 1888ء میں اس کے لیے سرکاری پروانہ مسٹر جے پی ہیوٹ انڈر سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا نے 11/جون 1888ء کو شملہ سے جاری کیا۔

(محمد حسین بٹالوی، اشاعۃ السنۃ، ص:47، لاہور، ج:11 شمارہ،2)

وہابی علما کی انگریزوں کے ساتھ وفاداری کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ 1886ء میں ملکہ برطانیہ کی گولڈن جبلی منائی گئی۔ اس وقت وہابی علما نے جو انھیں سپاس نامہ پیش کیا تھا، وہ یہ تھا۔

''پس واضح ہو کہ اس موقع سے جو کچھ اہلِ حدیث نے کیا ہے، ان میں چند یہ ہیں:

(1) ملکۂ معظمہ کی حکومت پنجاہ سالہ پر خوشی کرنا اور اس خوشی میں مسلمانوں کو کھانا کھلانا۔

(2) برٹش حکومت کی اطاعت وعقیدت ظاہر کرنا اور اس کو فرضِ مذہبی بتانا۔

(3) ملکۂ معظمہ اور اس کی سلطنت کے لیے دعاے سلامتی وحفاظت وبرکت کرنا۔'' (اشاعۃ السنۃ، ص:229)

ایسے علما کی جو حکومتِ وقت کے وفادار تھے، ان کی ایک طویل فہرست ہے، جن کی تفصیل اس دور کی لکھی جانے والی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

7- اس دور کے علما کے سرخیل حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی اور حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد صادر فرمایا۔ علماے حق نے اس کی تائید کی۔ اس کا ذکر متعدد مورخین اور جرائد کے مدیروں نے کیا ہے۔ مولوی اسماعیل دہلوی اور سید احمد راے بریلوی نے نہ یہ کہ صرف فتویٰ جہاد کی مخالفت کی بلکہ انھوں نے بجاے انگریزوں کے پٹھانوں سے جہاد کیا اور اس میں وہ مارے گئے۔

راقم کے اس قول کی تائید میں متعدد کتابیں ہیں جن کے مصنفین کا تعلق خود وہابی مکتب فکر سے ہے۔ محمد میاں ناظم جمعیۃ ''علماے ہند کا شان دار ماضی'' میں اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

''دوسری تنظیم جو اس تحریک (غدر) کے زمانے میں موجود تھی، جس کو وہابی تحریک کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے، جس کا مرکز صادق پور تھا، یہ تنظیم بہ حیثیت تنظیم تحریک سے الگ رہی۔ بلکہ اگر مولانا عبد الرحیم صاحب مصنف ''الدر المنثور'' کا قول صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ تنظیم 1857ء کے تحریک کی مخالف رہی۔''

(علماے ہند کا شان دار ماضی، ج:4، ص:213)

سید احمد راے بریلوی اور مولوی اسماعیل دہلوی کے موقف کے بارے میں سر سید احمد خاں کا قول لکھنا کافی ہوگا، جو انھوں نے ان دونوں حضرات کے بارے میں لکھے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''سید احمد راے بریلوی اور اسماعیل دہلوی کی تحریک کا انگریزی حکومت کی مخالفت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، بلکہ یہ لوگ انگریز کے ایما پر سکھوں سے لڑنے کے لیے نکلے تھے۔''

(مقالات سرسید، حصہ نہم، ص:125 تا 297)

مضمون کے آخر میں مقالات سرسید کے مرتب نے حاشیے میں لکھا ہے کہ:

''سرسید نے اس مضمون میں یہ بات بار بار لکھی ہے کہ حضرت سید احمد بریلوی شاہ اسماعیل شہید انگریزی حکومت کے ہرگز ہرگز مخالف نہیں تھے اور نہ ہی انھوں نے کبھی ان کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ سرسید کے اس بیان کی تائید متعدد مورخین نے بھی کی ہے۔ چناں چہ نواب صدیق حسن خاں نے ترجمانِ وہابیہ مطبوعہ امرت سر کے، ص:21 اور 88 پر سوانح احمدی مولفہ مولوی محمد جعفر تھانیسری میں بیس مقامات پر اسی طرح حضرات شاہ اسماعیل شہید کی سوانح موسوم بہ حیات طیبہ کے صفحات 159, 293,294 پر بھی اسی خیال کو پیش کیا ہے۔''

(مقالات سرسید، حصہ نہم، ص:207)

موجودہ بریلوی جماعت کے اسلاف نے ہی جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے

انقلاب 1857ء کے نو سال بعد مدرسہ دیوبند کا سنگ بنیاد رکھا گیا

از: مولانا محمد ادریس بستوی، نائب ناظم الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور

ہندستان کی جنگ آزادی کی ابتدا 1757ء سے ہوئی جو 1947ء میں تقسیمِ وطن پر اختتام کو پہنچی۔ اس ایک سو نوے سالہ جنگ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کا پہلا دور 1757ء سے شروع ہو کر 1857ء پر ختم ہوا اور دوسرا دور جو در اصل تحریکِ آزادی کے نام سے معنون ہونا چاہیے، 1885ء سے شروع ہو کر 15/اگست 1947ء میں آزادیِ ہند پر اختتام پذیر ہوا۔ پہلے دور میں باضابطہ میدانِ جنگ میں معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ بے شمار لوگوں نے انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے اپنی جانوں کو قربان کیا۔ لیکن غدارانِ وطن کی اعانت سے سات سمندر پار سے آنے والی سفید فام قوم یکے بعد دیگرے ہر میدان میں کامیاب ہوتی چلی گئی۔

انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ 1757ء میں پلاسی کے میدان میں لڑی گئی۔ دوسری جنگ 1764ء میں بکسر (بہار) میں وقوع پذیر ہوئی۔ تیسری جنگ علاقہ روہیل کھنڈ 1774ء میں لڑی گئی، چوتھی جنگ 1799ء میں سرنگا پٹنم (جنوبی ہند) میں ہوئی۔ اس کے بعد 1801ء میں انگریزوں نے اودھ اور روہیل کھنڈ اور 1803ء میں بندیل کھنڈ اور دہلی کو اپنی شاطرانہ چالوں سے معاہدوں کے جال میں پھانس کر عملی طور پر پورے ملک پر اپنی حکومت قائم کر لی اور حقیقتاً براے نام کچھ نواب اور راجا باقی رہ گئے، لیکن اصل اقتدار انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ یہاں تک کہ دہلی کا حکمراں بھی انگریزوں کا تنخواہ دار اور محکوم وفرماں بردار بنا دیا گیا۔ یہی وہ حالات تھے جن کی وجہ سے 1857ء کا ملک گیر انقلاب، تصادم اور ہنگامہ ہوا، جس میں مسلمانوں کی قوت فنا ہو گئی۔ انگریزوں کی چیرہ دستیاں بڑھ گئیں، انگریز پورے ملک پر قبضہ کرنے کے بعد دہلی کے تخت وتاج کے مالک بن گئے۔

1857ء تک برصغیر ہند وپاک اور بنگلہ دیش کا مسلمان دیوبندی اور بریلوی مسلک میں تقسیم نہیں ہوا تھا، نہ دیوبندی اور بریلوی نام سے کوئی جماعت عالمِ وجود میں آئی تھی۔ یہ مسلکی تقسیم ہندستانی مسلمانوں میں انگریزوں کی غلامی کے بعد پیدا ہوئی۔ 1857ء کی جنگ مسلمان ہار گیا اور اس کے بعد 1866ء میں ایک عربی مدرسے کی بنیاد قصبہ دیوبند ضلع سہارن پور میں رکھی گئی جو بعد میں دار العلوم دیوبند بن گیا اور یہاں کے فضلا اپنے کو دیوبندی کہنے اور لکھنے لگے۔ اس تاریخی حقیقت کے بعد اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ 1857ء کی جنگ آزادی علماے دیوبند نے لڑی ہے تو اس دعویٰ کو جھوٹ، غلط بیانی اور تاریخ کے چہرے پر سیاہی پوتنے کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ آج کل کچھ خود ساختہ مورخ اور مصنف یہ ذلیل حرکت کر رہے ہیں اور لوگوں کو باور کرانے کی کوشش میں لگے ہیں کہ در اصل جنگ آزادی علماے دیوبند نے لڑی ہے۔ بدیہی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب 1857ء کے نو سال کے بعد مدرسہ دیوبند کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو یہ جنگ آزادی علماے دیوبند نے کیسے لڑی؟

یہ حقیقت ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں علما نے قائدانہ رول ادا کیا جس کی وجہ سے بڑی تعداد کو انگریزوں نے جوشِ انتقام میں عبور دریاے شور (کالا پانی) اور تختۂ دار پر چڑھانے کی سزا سے لے کر یہ وحشیانہ سزا بھی دی کہ ان میں سے بعض کو زندہ سور کی کھال میں سل کر کھولتے ہوئے گرم تیل میں ڈال دیا۔ ایسی انسانیت سوز حرکت دنیا میں کسی قوم نے کسی قوم کے ساتھ نہیں کی ہے۔ انگریزوں کے اقتدار میں آنے کی یہ وہ سیاہ تاریخ ہے جو ہمیشہ کے لیے انگریز قوم کو داغ دار کر گئی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 1857ء اور اس سے پہلے جن علما نے حریت کا صور پھونکا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا، ان کا تعلق کس جماعت سے تھا؟ وہ دیوبندی تھے، بریلوی تھے یا کسی اور جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ وضاحت پہلے کی جا چکی ہے کہ 1857ء کی جنگ کے خاتمے کے 9/سال بعد مدرسہ دیوبند عالمِ وجود میں آیا، اس لیے انھیں دیوبندی تو کہا ہی نہیں جا سکتا اور بریلوی کا لفظ بھی بہت بعد میں عوام وخواص میں ایک جماعت کی حیثیت سے متعارف ہوا، اس لیے یہ بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ بریلوی جماعت نے جنگ آزادی لڑی البتہ یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ وہ عظیم الشان رفیع المرتبت علماے کرام جنھوں نے جنگ آزادی میں اپنے خون کا ایک ایک قطرہ لیلاے حریت کے لیے قربان کر دیا وہ جماعت

اہلِ سنت سے تعلق رکھتے تھے اور انھیں کے پس رو، ہم مسلک، ہم عقیدہ، ہم خیال بریلوی جماعت کے علمائے کرام ہیں۔ اس لیے یہ دعویٰ قطعاً غلط نہ ہوگا کہ موجودہ بریلوی جماعت کے اسلاف نے ہی جنگ آزادی لڑی ہے اور انھوں نے ہی اس لڑائی میں خندہ پیشانی کے ساتھ تختۂ دار کو قبول کیا ہے۔ اس لیے آج جماعتی تقسیم کے بعد یہ دعویٰ بالکل حق ہے کہ جنگ آزادی بریلوی جماعت نے ہی لڑی ہے۔

بریلوی جماعت ان تمام علمائے حریت کو اپنے اسلاف میں شمار کرتی ہے جنھوں نے ایک صدی تک انگریزوں سے مقابلہ کیا اور جگہ جگہ اپنے مقدس خون سے نقش آزادی ابھارا۔ تاریخ کا عمیق مطالعہ روز روشن کی طرح اس حقیقت کو عیاں کردیتا ہے کہ آج بھی تمام بریلوی علما ان علمائے کرام کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے انھیں اپنے اسلاف میں شمار کرتے ہیں اور ان میں سے بیش تر کو اپنے اساتذہ، استاذ الاساتذہ اور پیر و مرشد تسلیم کرتے ہیں، اس کے برخلاف موجودہ علمائے دیو بندان اسلاف کو اپنے اساتذہ اور اکابر کے زمرے میں شمار کرنے کو تیار نہیں ہیں بلکہ ان کے خلاف زہر افشانی کرتے رہتے ہیں۔

جن اکابر نے شمع آزادی پر اپنے کو پروانہ وار نثار کیا وہ دیو بند کے اکابر میں شمار نہیں کیے جاتے بلکہ وہ سب کے سب علما بریلی کے پیشوا، رہ نما اور مقتدا ہیں۔

اس سلسلۂ بحث میں ایک نام مشترک ہے جسے علمائے دیو بند اپنے اکابر میں ضرور شمار کرتے ہیں اور علمائے بریلی بھی ان کا بھر پور احترام کرتے ہیں، وہ نام شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہے، اس لیے اس پر تفصیلی گفتگو ضروری ہے کہ آخر حاجی صاحب مرحوم و مغفور کس جماعت کے بزرگ اور رہ نما کہے جاسکتے ہیں اور کون سی جماعت نظریاتی اعتبار سے ان کے مسلک کی حامل اور ان کی تصنیفات میں درج نظریات کو ماننے والی ہے۔

اس موقع پر پوری ذمہ داری سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ علمائے دیو بند ہزار کہیں کہ حاجی صاحب ہمارے بزرگ اور رہ نما ہیں مگر ان کی یہ بات قابلِ تسلیم نہیں ہے کیوں کہ کسی بزرگ و رہ نما سے وابستگی دراصل ان نظریات و عقائد کے تسلیم کرنے پر موقوف ہے جن کا اظہار انھوں نے اپنی کتابوں اور ملفوظات میں کیا ہے۔ اول اول اکابر دیو بند حاجی صاحب سے وابستگی کا اظہار کرتے رہے، لیکن نظریاتی اختلاف کی بنا پر ان میں شدید اختلاف پیدا ہوتا گیا اور جب حاجی صاحب نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''فیصلۂ ہفت مسئلہ'' لکھ کر ملک و بیرون ملک شائع کرائی تو تمام علمائے دیو بندان کے باغی اور دشمن ہوگئے۔ حد تو یہ ہے کہ حاجی صاحب کی کتابوں کی ہولی دیو بندی علما نے جلائی اور ان کے نظریات سے کھلم کھلا اختلاف کرتے ہوئے نئی جماعت بنام دیو بندی جماعت کی بنا ڈالی۔

اس لیے برملا کہا جائے گا کہ علمائے دیو بند اور جماعت دیو بند کا حاجی امداد اللہ صاحب سے عقیدت مندانہ نہیں بلکہ باغیانہ تعلق ہے اور حاجی صاحب مرحوم و مغفور کو دیو بندی جماعت ہرگز اپنا رہ نما نہیں کہہ سکتی ہے۔

یہی ایک نام ایسا تھا جو جنگ آزادی میں انگریز دشمنی میں صف اول میں نظر آتا ہے اور جب علمائے دیو بندان سے الگ تھلگ ہوگئے تو اب دیو بندی جماعت کا پورا کشکول مجاہدینِ آزادی سے خالی ہے۔ ایک بھی شخص 1858ء تک اس جماعت کا جنگ آزادی میں شامل نہیں ہوا۔ ان تمام لوگوں نے انگریزوں کی ہم نوائی کی اور ان غیر ملکیوں کے تسلط کے لیے ہر ممکن مدد کرتے رہے۔

جب پوری جماعت جنگ آزادی میں صفر نمبر پر پہنچ گئی تو کچھ جعل سازوں نے تاریخ سازی کا بیڑا اٹھایا اور غلط بیانی اور دروغ گوئی کا لبادہ پہن کر اپنے دو مولوی صاحبان کو جنگ آزادی کا ہیرو ثابت کرنے کے لیے آنکھوں میں دھول جھونکنا شروع کردیا، جس کی تازہ مثال اتر پردیش کی حکومت کی جانب سے شائع ہونے والے اردو ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ کا وہ نمبر ہے جو 1857ء کی جنگ آزادی کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس کے ایک مضمون نگار فیصل احمد ندوی بھٹکلی ندوۃ العلما لکھنؤ نے مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی صاحبان کو جنگ آزادی کا سورما ثابت کرنے کے لیے بالکل غلط طور پر یہ لکھا ہے کہ مولانا قاسم صاحب معرکۂ جنگ میں نہ صرف شریک تھے بلکہ قیادت کا فریضہ انجام دیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا۔ شاملی اس علاقے کا مرکزی میدان تھا وہاں تحصیل بھی تھی اور کچھ انگریز فوجی بھی رہتے تھے۔ قرار پایا کہ شاملی کی طرف کوچ کرکے اس پر حملہ کیا جائے، چناں چہ چڑھائی ہوئی۔ شاملی کے میدان میں جنگ لڑی گئی، انگریزی فوج سے مجاہدین کا سخت مقابلہ ہوا، انجام کار مجاہدین کو غلبہ ہوا۔ مقامی حکام نے رپورٹوں میں ان انقلابی مجاہدین کے جوش و خروش سے بھر پور دلیرانہ حملوں کا حیرت سے تذکرہ کیا ہے۔ انگریز فوج نے پسپا ہوکر تحصیل میں پناہ لی، مجاہدین نے تین دن محاصرہ کے بعد تحصیل کا دروازہ توڑ لیا، اور اندر داخل ہوئے۔ دست بدست جنگ ہونے لگی، اسی اثنا میں حضرت حافظ ضامن شہید ہوئے۔''

(ماہ نامہ نیا دور انقلاب 1857ء نمبر، ص:92-93)

اب میں اس کے بعد ایک ایسی تاریخی دستاویز آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جو دیو بندی جماعت کے مشہور و معتبر مصنف مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی نوشتہ اور شائع کردہ ہے۔ مولانا میرٹھی نے ایک متعارف کتاب تذکرۃ الرشید کے نام سے لکھی جس کے حصہ اول کے حاشیہ میں قصبہ شاملی میں انگریزوں سے ہونے والی آویزش کا تفصیلی ذکر اس طور پر کیا گیا ہے:

> ''اصل قصہ یوں سنا تھا کہ قاضی سعادت علی خاں پسر نجابت علی خاں رئیس اعظم زمیں دار تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے دو بیٹے تھے، جن میں بڑے لڑکے عنایت علی خاں نے باپ کے مرنے پر ریاست کا کام سنبھال رکھا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی عبد الرحیم خاں جو بڑے بھائی کو باپ کی جگہ سمجھتے تھے، باطمینان حسب خواہش جہاں جی چاہتا چلے جاتے اور امیرانہ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ حقیقت میں دونوں بھائی ایک دوسرے کے جاں نثار اور شیدا و عاشق زار تھے، اسی گھٹا ٹوپ اندھیاؤں میں جب کہ کئی جگہ غدر اور دہلی اس کا آشیانہ بنا ہوا تھا، عبد الرحیم خاں مع چند احباب کے سہارن پور گئے اور سرائے میں کسی دوست کے پاس ٹھہرے۔ زمیں دارانہ قضیوں میں آدمی کے دشمن بہتیرے ہو جاتے ہیں، چناں چہ ایک بنیا جس کو قدیم سے اس ریاست کے ساتھ عداوت تھی اتفاق سے وہاں مقیم تھا اس نے زمانۂ غدر کو غنیمت سمجھا اور پنکھی صاحب انگریز سے جو باغیوں کی سرکوبی کے لیے حکم موت کا مجاز بنا کر انتظاماً ضلع سہارن پور میں معین کیا گیا تھا، جا مخبری کی کہ تھانہ کا رئیس بھی کمپنی سے باغی ہوگیا ہے، چناں چہ اس کا بھائی دہلی میں کمک بھیجنے کے لیے ہاتھی خریدنے آیا اور کئی دن سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ادھر یہ جھوٹی مخبری ہوئی اور ادھر گلی کوچوں میں دشمنوں نے اس افواہ کو پھیلا دیا، یہاں تک کہ ایک گارد ست سرائے روانہ کیا گیا اور عبد الرحیم خاں مع ہمراہیان بالزام بغاوت جیل خانہ بھیج دیے گئے۔ زمانہ تھا احتیاط کا، فوراً ناکردہ گناہ جماعت کو پھانسی کا حکم ہوگیا اور اگلے دن قاضی عنایت علی خاں کو اپنے بھائی کے دنیا سے رحلت کی اطلاع ملی۔ اس خبر سے عنایت علی خاں پر رنج و غم کے پل ٹوٹ پڑے اور جوشِ حزن میں بھائی کے انتقام کا خیال پختہ ہوگیا۔ اتفاق سے چند فوجی سوار کہاروں کے کندھے پر کارتوس کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارن پور سے کرانہ کی طرف جارہے تھے کہ قاضی صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی اور یہ اپنے جنون میں مست چند رفقا اور رعایا کو ساتھ لے شیر علی کے باغ کی سمت سڑک پر جا پڑے اور جس وقت سوار سامنے سے گزرے ان کا اسباب لوٹ لیا۔ ایک سوار اسی جنگ میں زخمی ہوکر بہ سمت مشرق جنگل کو بھاگا مگر تھوڑے ہی فاصلے پر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس فساد کی خبر مظفر نگر پہنچی تو حاکمِ ضلع کی طرف سے تھانہ پر فوج کشی کا حکم ہوگیا، جس پر عنایت علی خاں نے فساد کھلم کھلا بلند کیا۔ چناں چہ شاملی کی طرف انگریز فوج کے جانے کی جھوٹی خبر پاکر نقارہ بجایا گیا اور جتھہ کا جتھہ تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑا۔ جس وقت گورنمنٹ کو اہل کاران تحصیل کے مارے جانے، خزانہ کے لوٹے جانے کی اطلاع ملی تو حاکم شاملی پہنچا اور چار طرف نقشوں اور قصبہ کی ویرانی و بربادی دیکھ کر غصہ سے تھرا اٹھا، آخر یہ کہہ کر کہ تھانہ بھون بھی اسی طرح مسمار کرا کر چھوڑوں گا، مظفر نگر واپس ہو گیا، اس لیے کہ تنہا تھا اور اس بدامنی کے وقت میں جان کا خطرہ قوی۔ چند ماہ بعد جب کہ امن ہوا اور دہلی کے فتح ہو جانے کی خبر مشہور ہوئی تو قاضی صاحب کو اپنی جان کی فکر ہوئی، یہاں تک کہ تھانہ میں یہ خبر گرم ہوئی

کہ علی الصباح انگریزی فوج یہاں پہنچنا چاہتی ہے۔
اس وحشت اثر اطلاع سے لوگوں کے تلوے نیچے سے زمین نکل گئی اور بھاگنے کو سوجھی کہ جدھر منہ سمائے نکل جائیں۔ چناں چہ آدھی رات کے وقت قاضی صاحب نے مع چند ہمراہیان کے تھانہ بھون کو خیر باد کہا اور بہ سمت نجیب آباد روانہ ہوئے اور وہاں سے خدا جانے کہاں گئے اور کیا ہوئے۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ سنا گیا ہے کہ قاضی عنایت علی کو ہمارے اکثر دینی حضرات نے کارروائی سے منع کیا اور کمپنی کی طرف سے یہی پیام پہنچایا گیا کہ تم فساد سے باز آجاؤ، اپنے بھائی کو صبر کرو، غلطی سے یہ حرکت ہوگئی، تو اگر تم انتقام سے باز آگئے تو تم کو تھانہ کا نواب بنا دیا جائے گا۔ مگر تقدیر کے مضبوط پنجوں سے بھاگ جانا طاقت سے باہر ہے۔ حق تعالیٰ کے علم میں جب اس گھرانے کی تباہی وجلاوطنی وگم شدگی وخانہ ویرانی اسی طرح مقدر تھی تو قاضی عنایت علی کیا سمجھتے۔ صبح صادق نمودار ہوئی تو بلائے بے درماں اپنے ساتھ لائی۔ تھانہ بھون سرکاری فوج سے گھیر لیا گیا اور مشرقی جانب سے گولہ باری شروع ہوگئی۔ دن نکلنے پر فوج قصبہ میں داخل ہوئی اور قتل وقتال ولوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ رات کی تاریکی چھانے سے پہلے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے کھول دیے گئے اور مکانات پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ دے دی گئی۔ اس عالم کس میرسی میں نواح وحوالی کے دیہاتوں نے لوٹ مار اور بے جا حرکتوں کا زیادہ حصہ لیا۔ خلاصہ یہ کہ رات کی تاریکی چھانے سے پہلے پہلے حاکم ضلع کا وہ قول پورا ہوگیا کہ ''شاملی کی طرح تھانہ بھون کو مسمار کردوں گا۔''

(حاشیہ تذکرۃ الرشید، جلد: اول، ص: 111-112)

مذکورہ بالا اقتباس جو مشہور کتاب ''تذکرۃ الرشید'' سے نقل کیا گیا ہے، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ علمائے دیوبند کے اکابر مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کا شاملی کی جنگ سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اور اگر کسی طرح کا تعلق ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی تو مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کی کتاب جھوٹ کا پلندہ اور اس کے مصنف کو بہت بڑا دروغ نویس، جھوٹا تسلیم کرنا پڑے گا، پھر تو سارا دفتر ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے لائق ہو جائے گا۔ اور اگر مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کی تصنیف تذکرۃ الرشید کو بحث سے الگ بھی کر دیا جائے تو بھی مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کو جنگ آزادی کا سپاہی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ کسی عصری تاریخ میں ان حضرات کا اس حیثیت سے کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

اس موقع پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب ان دونوں حضرات نے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا تو آخر مولانا قاسم نانوتوی صاحب کی گرفتاری کس سلسلہ میں ہوئی تھی۔ جس میں خود مولانا نے بار بار اپنی صفائی میں یہ کہا ہے کہ شاملی کی جنگ یا کسی اور شورش میں میں نے کوئی حصہ نہیں لیا ہے۔ مجھ پر اس جنگ میں حصہ لینے کا الزام بالکل غلط لگایا گیا ہے اور مولانا کی یہ صفائی اتنی باوزن تھی کہ انگریزی حکومت نے اسے پورے طور پر تسلیم کرتے ہوئے مولانا کو باعزت بری کر دیا۔ انگریزوں کی سمجھ میں دلائل سے یہ بات آگئی کہ یہ مولانا تو اپنے آدمی ہیں جو غلط فہمی کی وجہ سے گرفتار کر لیے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں موجودہ علمائے دیوبند کے اکابر نے قطعی کوئی حصہ نہیں لیا ہے، البتہ بریلوی جماعت کے جو اسلاف اس وقت بنام جماعت اہل سنت متعارف تھے اور آج بھی اسی نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے ہی پوری جنگ آزادی لڑی، تختۂ دار پر چڑھے، عبور دریائے شور (کالا پانی) کی سزا کاٹی اور ہنستے ہوئے جام شہادت نوش کرتے رہے۔ اس تاریخی حقیقت سے کوئی منصف انکار نہیں کرسکتا۔

البتہ جنگ آزادی کا دوسرا دور جو دراصل تحریک آزادی ہے، جس میں نہ کوئی میدان کارزار گرم ہوا، نہ تلواریں چلیں، جس کی ابتدا 1885ء سے ہو کر یہ جنگ 1947ء تک چلی۔ اس میں تحریک شروع ہونے کے 46ر سال بعد کچھ علمائے دیوبند نے ضرور حصہ لیا۔ جس کی ابتدا 21-1920 سے ہوتی ہے، مگر اس پورے ستائیس سالہ دور تحریک میں ان علمائے دیوبند نے قائدانہ رول ادا کرنے کے بجائے ہندستان کے قومی لیڈر مسٹر گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو کے فالور کی حیثیت سے شریک رہے اور انھیں کی جے بولتے رہے، اس لیے اس تحریک آزادی کا بھی انھیں قائد اور رہنما قرار نہیں دیا جاسکتا۔

انقلاب 1857ء کا جہادی پہلو

صحیح یا غلط

محمد شہباز عالم مصباحی

1857ء کے جنگ کے مطالعہ سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ غیر ملکی انگریزوں کے پیہم ظلم وستم، جارحیت وسفاکیت، قتل وغارت گری اور مذہبی مداخلت کے ردعمل میں 11ر مئی 1857ء سے شروع ہوکر[1] 21ر ستمبر کو ختم ہونے والی[2] انقلاب 1857ء کی تحریک میں جس چیز نے روح پھونکی تھی، وہ علامہ فضل حق خیر آبادی اور اس وقت کے دیگر اکابر علما کا وہ معرکہ آرا فتویٰ تھا جسے جنرل بخت خاں کے 26ر مئی 1857ء کو دہلی میں ورود[3] اور حضرت علامہ سے مشورہ کے بعد جامع مسجد میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی پورے ملک میں سورش برپا ہوگئی۔ صرف دہلی میں نوے ہزار سپاہی جمع ہوگئے تھے۔ اس فتویٰ پر حضرت علامہ کے علاوہ پانچ اور علما کے دستخط تھے[4] یہ فتویٰ ہمیں دستیاب نہیں ہو سکا لیکن اسی طرز کا ایک فتویٰ جو حضرت علامہ کے ورود دہلی سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا[5] اور بقول مولوی ذکاء اللہ جس کا چرچا شہر میں بہت کم تھا[6] ہمیں ملا ہے، ہم اسے ذیل میں نقل کرتے ہیں:-

''کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں؟ اور اوپر لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد چاہیے یا نہیں؟ بیان کرو، اللہ تم کو اجر دے۔''

جواب: در صورت مرقومہ فرض عین ہے، اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے، چناں چہ اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے بسبب کثرت اجتماع افواج کی، اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے، تو فرض عین میں کیا شک رہا اور اطراف وحوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں، باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلہ سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہوگا اور جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور قتل اور غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض ہو جائے گا، بشرطان کی طاقت سے۔''[7]

اس فتوے کے مجیب مولانا نور جمال ہیں، ان کے علاوہ 35ر اور علمائے کرام کے دستخط اس فتوے پر ثبت ہیں[8] اور حضرت علامہ کے مرکزی فتویٰ کی بنیاد ہی پر 1857ء کی جنگ ''جہاد'' قرار پائی اور اس کے جاں نثاروں کو ''شہید'' اور ''مجاہد'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

جنگ 1857ء کی جہادی حیثیت کی جانکاری صرف اہل علم، ارباب افتا اور شاہی دربار سے وابستہ افراد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اس جنگ میں شریک ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی اس بات سے واقف تھا اور اسی وجہ سے وہ بڑا سے بڑا خطرہ بھی مول لیتا تھا۔ کیوں کہ اسے اس کا یقین تھا کہ یہ کوئی عام جنگ نہیں بلکہ ایک مقدس جہاد ہے، جس میں اگر اسے موت بھی حاصل ہوتی ہے تو وہ ہزاروں دنیاوی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ ذیل میں نقل کردہ واقعات سے ہماری بات کی صداقت سامنے آتی ہے:

''گرانٹ جیکب نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب باغیوں کو توپ سے اڑایا جا رہا تھا تو ان میں سے ایک ایسا تھا جو صرف زخمی ہوا، لیکن اس کے باوجود وہ فخر سے سینہ تان کر، دوسرے راؤنڈ کے لیے توپ کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ یہ دیکھ کر جیکب اس کے قریب گیا اور کہا کہ مجھے تم پر رحم آتا ہے، شاید دھوکا دے کر تمھیں بغاوت میں پھنسا دیا گیا ہے۔ اگر تم

سرکار کی مدد کرو اور باغی سرداروں کے نام بتادو تو تمھاری جان بچ سکتی ہے۔ لیکن یہ زخمی شخص اپنے زخم کی تکلیف سے جھکا، خاموش رہا، میری طرف ترش روئی اور حقارت سے دیکھا اور برملا کہا "میں نے جو کیا ٹھیک کیا" یہ کہہ کر اس نے منہ پھیر لیا اور دلیری سے توپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔[9]

گوری شنکر جو انگریزوں کا ایک مخبر تھا ، اس نے 7/ستمبر 1857ء کو انقلابیوں کے متعلق جو رپورٹ بھیجی اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"دو دن ہوئے تقریباً چار سو غازیوں کا ایک دستہ گوالیار سے پہنچا تھا۔ یہ لوگ بالکل کنگال ہیں۔ نواب محمد میر خاں کے صاحب زادے میاں بڈھن نے ان سے دریافت کیا، ان کے پاس خوراک وغیرہ کا بندوبست ہے، انھوں نے جواب دیا کہ وہ لوگ شہادت کے لیے وہاں پہنچے ہیں ان کو خوراک وغیرہ کی ضرورت نہیں۔"[10]

1857ء کی جنگ ایک جہاد، مظلوم ہندستانیوں کی جائز صدائے احتجاج اور نالۂ برحق تھی۔ یہ اس وقت کے دانش ور اور حالات پر گہری نظر رکھنے والے علمائے کرام کا "شرعی فیصلہ" ہے لیکن اسی دور میں علما کا ایک چھوٹا سا گروپ[11] اس فیصلے کو غلط قرار دیتا تھا اور اس کے برعکس اپنی "رائے" رکھتا تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق ان حالات میں انگریزوں کے خلاف مسلمانوں پر جہاد کا فرض ہونا تو درکنار، جائز بھی نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ان علما کے کیا مقاصد تھے، ہم ان سے بحث نہیں کریں گے۔ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ 1857ء ہی میں جنگ 1857ء کی معروف عام، تحقیق سے ثابت اور حالات کے عین مطابق جہادی حیثیت سے انکار کرنے والا ایک گروہ پیدا ہو چکا تھا، جس کا ثبوت ہمیں ذیل کے واقعات سے ملتا ہے۔ ایک واقعہ کے بارے میں مولانا وحیدالدین خاں لکھتے ہیں:

"1857ء کے زمانے میں جب علما نے انگریزوں کے خلاف جہاد بالسیف کا فیصلہ کیا، اس وقت دیوبند میں ایک بڑے عالم مولانا شیخ محمد صاحب تھے۔ مولانا کی رائے دوسرے عالموں کے بالکل برعکس تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔ چناں چہ دیوبند میں ایک مشاورتی اجتماع ہوا۔ اس میں دوسرے علما کے ساتھ مولانا رشید احمد گنگوہی مولانا قاسم نانوتوی بھی شریک تھے۔

اس واقعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں:

"اس اجتماع میں جہاد کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی، حضرت نانوتوی نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنانِ دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلاتِ جہاد نہیں ہیں، ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔ مولانا نانوتوی نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب نے سکوت فرمایا۔"[12]

دوسرا واقعہ مولوی ذکاء اللہ کی زبانی سنیے:

"مولوی رحمت اللہ اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے۔ وہ بڑے عالم فاضل تھے، عیسائی مذہب کے رد میں صاحبِ تصنیف تھے، وہ قلعہ کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانش مند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامۂ فساد برپا تھا۔"[13]

آج بھی چند جدت پسند "مفکرین" اور بزعمِ خویش مجتہدین اسی چھوٹے سے گروہ کے فکری اثاثے کو بنیاد بنا کر 1857ء کی جنگ کو جہاد کہنے سے گریز کرتے ہیں اور اسے بغاوت اور غدر کا نام دیتے ہیں۔

1857ء کے اقلیتی علما کو کن باتوں نے جنگ کے عدم جواز کا فتویٰ دینے پر مجبور کیا تھا، ہم ان کے بیان سے صرف اس لیے بچنا چاہتے ہیں کہ ایک دوسری بحث نہ پیدا ہو جائے اور پھر ان باتوں کو 1857ء کی تاریخ سے تھوڑا سا بھی شغف رکھنے والا شخص بھی جان سکتا ہے، بشرطے کہ مطالعہ میں غیر جانب دارانہ پہلو کو اپنائے۔ لیکن انقلاب 1857ء کے حوالے سے مفکرین نے جو اپنی رائے بنائی ہے، اس کی اصل بنیاد 1857ء کی جنگ کی ناکامی پر ہے۔ اگر یہی جنگ فتح سے ہم کنار ہوتی تو یہی نام نہاد مفکرین اس کو جائز، برحق اور جہاد ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے۔

اب تک کے بیان سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ شروع ہی سے 1857ء کی جنگ کے شرعی پہلو کے تعلق سے دو نظریے رہے ہیں۔ ایک نظریہ جمہور علمائے کرام کا ہے اور دوسرا ایک چھوٹے سے گروپ اور اس کے ہم نواؤں کا۔ اب ہمیں اس بات کا تفصیل سے جائزہ لینا ہے کہ کون سا نظریہ درست ہے اور یہی ہمارا اصل موضوع ہے۔ اس

سلسلے میں سب سے پہلے جہاد کا مفہوم، اس کے شرائط اور نصب العین جاننے کی ضرورت ہے تاکہ ہمیں ایک معیار مل جائے، جس کی روشنی میں ہم بحث کو خوب سے خوب انداز میں سمجھ سکیں۔

جہاد کا مفہوم: جہاد عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں محنت کرنا، مشقت اٹھانا اور کوشش کرنا۔ اصطلاحِ شرع میں جہاد کا مطلب ہے، اللہ کے راستے میں جنگ میں پوری توانائی صرف کرنا۔

اسلام کے نظریۂ جہاد کا فقہی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ وہ اصلاً بے قصوروں پر بے سبب ہونے والے ظلم و ستم اور جبر و تشدد کی دفاعی کارروائی کا نام ہے۔ عام حالات میں وہ فرض کفایہ ہے۔ متعلقہ خطے کے مکلف مسلمانوں نے اسے انجام دے دیا تو سبھی اس فریضۂ جہاد سے بری ہو جائیں گے۔ ہاں اگر حالات ایسے ہو جائیں کہ کفار کی شرارت سے تمام اہلِ اسلام متاثر ہوں اور مقابلے کے لیے مدمقابل کے عام لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوں اور دشمن اسلامی سرزمین کی حدود میں داخل ہو کر دندناتا پھرے تو ایسے موقع پر ہر صاحبِ تکلیف اور سچے مسلمان پر جہاد فرض ہو جاتا ہے، جو بنفسِ نفیس شرکت کر سکتا ہے، وہ شریک ہو، جس کے سامنے شرکت میں رکاوٹیں ہوں وہ دوسرے ذریعوں سے تعاون کرے، جہاد میں حصہ لینا بہر حال سب پر ضروری ہے۔ ایسی ہی صورتِ حال کو فقہا "نفیر عام" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے بارے میں فقہا نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر مشرق میں کسی خاتون پر دست درازی ہو تو مغرب کے مسلمان پر بھی اس کا تحفظ و تعاون لازم ہے۔ ہدایہ میں ہے:

"الجهاد فرض على الكفاية اذا قام به فريق من الناس سقط عن الباقين الا ان يكون النفير عاماً و حينئذ يصير من فروض الاعيان."[14]

اسی میں ہے:

"فان هجم العدو علىٰ بلد و جب على جميع الناس الدفع."

اگر دشمن شہر پر حملہ آور ہو جائیں تو اس کا دفاع تمام لوگوں پر واجب ہے۔

جہاد کے شرائط:

1- جہاد اسی حالت میں فرض ہے جب کہ مسلمانوں کے پاس خلیفہ یا سلطان ہو اور وہ اپنے امرا و حکام اور علمائے کرام کے مشورہ سے اعلانِ جہاد کرے۔

2- مسلمانوں کے پاس مقابلے کی استطاعت ہو اور فوج کی ایک بھاری تعداد ہو، ورنہ سلطانِ اسلام اگر یہ سمجھے کہ کفار زائد ہیں تو ایسی حالت میں ان سے قتال ناجائز ہے۔ هذا اذا غلب على ظنه انه يكافئهم و إلا فلا يباح قتالهم. (رد المحتار)

3- آلاتِ حرب کافی مقدار میں ہوں۔

4- مسلمانوں کا مفاد یقینی ہو یا یہ کہ اس کا ظن غالب ہو۔

5- جہاد کی فرضیت کے لیے لازم اور مطلوب حالات موجود ہوں جیسے کوئی شوریدہ سر جماعت مسلمانوں کے وجود اور عزت و وقار پر حملہ آور ہو اور ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنے لگے، لوگوں کا سکون و چین تباہ و برباد کر دے اور اپنے مادی مفادات کے حصول اور ترجیح میں ظلم و عداوت کا ایسا طوفان کھڑا کرے کہ آدمی کا دین و ایمان اور جان و مال محفوظ رہنا مشکل ترین مسئلہ بن جائے۔

جہاد کا نصب العین: جہاد کا مقصد حصولِ اقتدار و دولت یا ذاتی غیظ و غضب اور انتقام کی آگ بجھانا نہیں ہے بلکہ غلبۂ دینِ حق، قیامِ امن، انسدادِ ظلم اور استیصالِ فتنہ و دفعِ شر ہے۔

جہاد کے مفہوم، شرائط اور نصب العین سے آگاہی کے بعد اب ہم 1857ء کے حالات کا جائزہ لیں گے اور ان میں شرائطِ جہاد کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ہماری یہ کوشش کامیابی سے ہم کنار ہوتی ہے، تب تو 1857ء کے جمہور علما کا فتوائے جہاد صحیح، برحق اور برمحل ہوگا اور اس کی ضرورت و صداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا، ورنہ ہم بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ یہ ان کا جذباتی، جنون خیز، ناعاقبت اندیشانہ اور پوری قوم کو ہلاکت و تباہی کے غار میں دھکیلنے والا اقدام تھا۔

1857ء اور اس سے قبل کے ظالمانہ حالات: ہم حالات میں چھوٹی چھوٹی سرخیوں کے ذریعہ صرف ان چیزوں کو بیان کرنے کی کوشش کریں گے جو جہاد کی فرضیت کے لیے لازم و مطلوب ہیں، کیوں کہ یہاں دیگر احوال کا بیان فائدہ سے خالی ہوگا۔

کاشت کاروں کا استحصال: کسانوں کا استحصال کرنے کے لیے انگریزوں نے ایک تباہ کن اور بھاری شرح مال گزاری ان

کی فصلوں پر مقرر کر رکھی تھی۔ شمالی ہندستان میں 1822ء کے ریگولیشن vii کے دفعات کے ماتحت مال گزاری زمین کی کل پیداوار کا 80 فی صد مقرر کی گئی تھی۔[15] یہ سیاہ اصول بھی صرف کاغذ پر تھا ورنہ عملی طور پر جو مال گزاری وصول کی جاتی تھی وہ پیداوار کے تناسب سے کہیں اونچی ہوتی تھی۔[16] اس استطاعت سے باہر مال گزاری نے زرعی ترقی کو روک دیا تھا اور کاشت کار بدترین مفلسی اور عدم وسائل کا شکار ہو گئے تھے۔

اس بھاری مال گزاری کے ساتھ انگریزوں کی دوسری ظالمانہ کارروائی یہ تھی کہ وہ کاشت کاروں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ وہی فصل اگائیں جس سے ان کا فائدہ ہو، خواہ وہ کاشت کاروں کے لیے نفع مند ہو یا نہ ہو، مثلاً دھان کے موسم میں اگر انھیں افیون سے غیر معمولی نفع حاصل ہونے کی توقع ہوتی تو وہ کسانوں کو افیون کی فصل اگانے پر مجبور کرتے۔[17]

تاجروں پر ظلم و ستم: بنگال میں سیاسی طاقت سنبھالنے کے بعد انگریزوں نے ملک کی تجارتی کاروائیوں پر بھی اپنی اجارہ داری قائم کرلی۔ اس اجارہ داری کے نتیجے میں نجی تاجروں کی چیزیں بالخصوص مغلوں (مسلمانوں) یا ہندوؤں کی ملکیت والی اشیا عام سڑکوں پر روک کر، کرایہ وصول کرنے والے گودام تک لے جائی جاتی تھیں۔ ان اشیا کے مالکان کو اکثر مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے سامانوں کے ساتھ ایسے جہازوں پر سوار ہوں جن کے بارے میں ان کی رائے اچھی نہیں ہوتی تھی اور ایسے سفر پر روانہ ہوں جس کی منزل اور جس کا انتظام ان کی تجارتی اسکیم کے خلاف ہوتا تھا۔ راستے کے باہر اور نامانوس بندرگاہوں پر چھوڑ دیے جانے سے سامان کا نقصان ہو جاتا تھا اور کبھی کبھی وہ ضائع بھی ہو جاتا تھا۔[18]

انگریزوں نے کسٹم ڈیوٹی اور مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے مقرر محصول کی شرحوں میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا تھا اور ان چیزوں پر بھی کسٹم ڈیوٹی لگا دی تھی جو ابھی تک اس سے بری تھیں اور نئے نئے محاصل درآمد و برآمد اور چنگی کی حد بندیاں کھڑی کر کے تاجروں کو طرح طرح کی مشکلات میں ڈال دیا تھا۔[19]

صنعت کاروں کے ساتھ ناروا سلوک: اسٹیم کی طاقت اور مشینری کے استعمال کی بدولت انیسویں صدی کی اول دہائیوں میں انگلستان اس قابل ہو گیا تھا کہ وہ یورپ کے بازاروں میں ہندستان کے سامانوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس لیے برطانیہ نے اپنے تیار کردہ سامانوں کے لیے موافق فضا پیدا کرنے کی غرض سے ہندستانی اشیا کی درآمد پر بہت ہی زیادہ بھاری ٹیکس لگا دیے تا کہ ہندستانی اشیا کی درآمد نہ ہو سکے اور اس چیز نے ہندستانی صنعت کاروں کی کمر توڑ دی تھی۔[20]

ولسن لکھتا ہے:

یہ ضروری ہو گیا ہے کہ موخر الذکر (برطانوی کاری گروں) کی حفاظت یا تو ہندستانی مال کی قیمت پر 70-80 فی صد ٹیکس لگا کر یا مال کا داخلہ بند کر کے کی جائے۔[21]

ہندستانیوں کا مال خریدنے کے لیے کمپنی نے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ بھی نہایت ظالمانہ اور غریب جولاہوں کا حق مارنے کے مترادف تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مال خریدنے کے لیے بھاری تنخواہ پر کچھ ایجنٹ رکھے تھے جن کو گماشتہ کہا جاتا تھا۔ ہر گماشتہ کے ساتھ ایک کلرک اور ایک خزانچی ہوتا تھا۔ یہ سب مقررہ اوقات پر گاؤں میں خریداری کرنے جاتے تھے اور پورے طور پر اپنی مرضی سے خریداری کرتے تھے۔ اس میں غریب جولاہوں کی مرضی کا کچھ بھی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ گماشتے جہاں چاہتے تھے ان سے دستخط کرا لیتے تھے اور جو رقم جولاہوں کو دی جاتی تھی اس کے لینے سے اگر وہ انکار کرتے تو انھیں ہاتھوں پیروں اور کمر سے باندھ دیا جاتا تھا اور کوڑے لگانے کے بعد ہی چھوڑا جاتا تھا۔[22] گماشتے سامانوں کا جو دام مقرر کرتے تھے وہ کم از کم پندرہ فی صد اور بعض حالات میں چالیس فی صد اس سے کم ہوتا تھا جو عام بازار میں آزادی سے فروخت کرنے پر ملتا تھا۔[23]

اس کے علاوہ انگریزوں کا ایک ظلم یہ تھا کہ انھوں نے کچھ مال کے دام حد سے زیادہ بڑھا دیے تھے تا کہ ہندستانی دست کار انھیں خرید نہ سکیں اور اس طرح ہندستانی صنعت زوال پذیر ہو جائے۔[24]

اس وقت ہندستان میں عموماً یہی تین طرح کے لوگ تھے اور ہر کوئی اپنے اپنے دائرے میں انگریزوں کے ظلم و ستم اور جبر و تشدد کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ اور اس طرح شہرت، دولت اور طاقت حاصل کرنے کے تمام ذرائع ہر خانے اور ہر سطح کے لوگوں پر مسدود کر دیے گئے تھے اور اس کے ساتھ ظلم بالائے ظلم یہ تھا کہ انگریزوں نے عوامی اعزاز حاصل کرنے، حکومت کی اعلیٰ ملازمتوں اور اعتماد و آمدنی کے بلند عہدوں پر فائز ہونے کے حقوق سے بھی ہندستانیوں کو یکسر محروم

کر رکھا تھا۔ انھیں صرف ان جگہوں پر ملازمت کرنے کا اہل سمجھا جاتا تھا جہاں ان کے بغیر کام نہ چل سکے۔[25]

یہ تو عام لوگوں کی صورتِ حال تھی۔ انگریزوں نے امرا یہاں تک کہ سلطانِ وقت کو بھی نہیں بخشا تھا۔ چناں چہ انقلاب کے اسباب کا تاریخی تجزیہ کرتے ہوئے مولانا امداد صابری لکھتے ہیں:

''چارلس مٹکاف ریزیڈینٹ دہلی نے نہایت ہی ہوشیاری سے شاہی اختیارات کا خاتمہ کر دیا، جس کی قدرے تفصیل اس طرح ہے:

1- دہلی میں طویل قید یا قصاص کے احکام پر بادشاہ سے منظوری لی جاتی تھی۔ یہ رسم موقوف کر دی گئی، جس سے بادشاہ کی ملکیت کا جو اثر باقی تھا وہ سرے سے ختم ہو گیا۔

2- ایک موقع پر لارڈ ایمہرسٹ گورنر جنرل نے صاف الفاظ میں اکبر ثانی کو تحریر کر دیا کہ آپ کی بادشاہت صرف نام کی ہے اور محض اخلاقاً آپ بادشاہ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

3- 1832ء میں قدیم دار السلطنت دہلی پر بادشاہ کی برائے نام بھی ملکیت ختم کر دی گئی اور دہلی کو ممالک مغربی و مشرقی میں شامل کر دیا گیا۔

4- 1835ء میں دہلی کے بادشاہ کے سکے کے بجائے سکہ کمپنی بہادر رائج کر دیا گیا۔''[26]

ہندستانیوں کا غربت و افلاس: درج بالا حالات نے لوگوں کو نادار اور محتاج بنا دیا تھا۔ ہزاروں لوگ بے روزگاری، فاقہ کشی اور بھوک مری میں مرتے تھے۔ لوگ اس قدر محتاج ہو گئے تھے کہ آنہ ڈیڑھ آنہ یومیہ پر انگریزی فوج میں ملازمت کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔ سرسید احمد خاں نے لکھا ہے:

''اہلِ حرفہ کا روزگار بسبب جاری اور رائج ہونے اشیاے تجارت و ولایت کے بالکل جاتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہندستان میں کوئی سوئی بنانے اور دیا سلائی بنانے کو بھی نہیں پوچھتا تھا۔ جولاہوں کا تار بالکل ٹوٹ گیا تھا۔''[27]

انگریزوں کے دورِ اقتدار میں اہلِ لکھنؤ جس بے چینی اور بے اطمینانی، مفلسی اور معاشی ابتری سے دوچار تھے، اس کی جھلکیاں ہمیں اس دور کے اخبار، ''سحر سامری'' کے درج ذیل تراشے میں نظر آتی ہیں۔ یہ تراشہ ملاحظہ کیجیے اور حالات کی ابتری کا اندازہ لگائیے:

''ان دنوں غلے کی گرانی ہے، گرانی خاطر ارزانی ہے۔ اس قدر مہنگا اناج ہے، آسیاے فلک بھی دانے کی محتاج ہے۔ جور فاقہ سے افاقہ نہیں۔ بے معاشی نے ہر قماش کے آدمی کا اطمینان کھو دیا، جس نادان و دانا نے حال بربادی کو سنا، رو دیا۔ ایک تو معاش نہیں، جائے تلاش نہیں۔ دوسرے وفورِ غم سے گندمی رنگ ہر بشر نیلا ہوا، گویا مفلسی میں آٹا گیلا ہوا۔ خونِ دل بجائے شراب ہے، لختِ جگر کباب ہے۔ بدحواسی سے زوال اعتدال مزاج ہوا۔ ہر غریب و مسکین روٹی کے ٹکڑے کا محتاج ہوا۔ چکنی چپڑی باتوں سے تدبیر نہیں چلتی، بہت سر پٹکتے ہیں دال نہیں گلتی، حاکم اس طرف عنانِ توجہ موڑتا نہیں، بس کیا کریں اکیلا چنا بھاڑ پھوڑتا نہیں۔''[28]

انگریزوں کی مذہبی مداخلت: جب پورے ہندستان میں انگریزوں کی عمل داری قائم ہو گئی تو انھیں یہ احمقانہ بات سوجھی کہ سارے ہندستانی ان کے ہم مذہب ہو جائیں۔ اس کے لیے انھوں نے طرح طرح کے طریقے اپنائے۔ عیسائی پادریوں کو کھلی چھوٹ دے دی۔ وہ عیسائی مبلغ اسکولوں میں، بازاروں میں، شفا خانوں میں، جیل خانوں میں، غرض جس جگہ موقع ملتا تبلیغ کرنے لگتے تھے۔ بعض اضلاع میں پادریوں کے ساتھ تھانے کے چپراسی بھی جاتے تھے۔ اور یہ پادری غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی۔[29]

اس حوالے سے علامہ فضل حق خیر آبادی لکھتے ہیں:

''انھوں نے تمام باشندگانِ ہند کو کیا امیر، کیا غریب، چھوٹے بڑے، مقیم و مسافر، شہری و دیہاتی، سب کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کو نہ تو کوئی مددگار و معاون نصیب ہو سکے گا اور نہ انقیاد و اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت ہو سکے گی۔''[30]

اسی میں آگے لکھتے ہیں:

''ان سازشوں کے علاوہ ان کے دلوں میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے۔ مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، شریف و پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا، نیز

دوسرے احکامِ دین مبین کومٹانا ، وغیر ذالک۔''(31)

''نورِ مغربی'' 1857ء کا ایک ہفت روزہ خبر نامہ تھا جو حوض قاضی (دہلی) سے شائع ہوتا تھا۔اس کی ایک رپورٹ ملاحظہ کریں:

''اخبارات کلکتہ سے دیکھا گیا ہے کہ مقامِ مذکور میں گوروں نے بہت سر اٹھا رکھا ہے۔سر بازار ہر ایک سے دنگا فساد کرتے ہیں اور مسجدوں اور گھروں میں گھس جاتے ہیں،باعث اس کا یہ ہے کہ قرار واقعی سزا نہیں ملتی۔''(32)

انگریزوں کی ایک دوسری مذہبی مداخلت یہ تھی کہ انھوں نے مسلمان فوجیوں کو سور کی چربی لگے ہوئے کارتوسوں کو دانت سے کاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔چناں چہ سر سید احمد خاں لکھتے ہیں:

''ایک اور بات سنو کہ یہ تمام بغاوت جو ہوئی تھی،بنا اس کی وہ کارتوس تھا جس پر سور کی چربی لگی ہوئی تھی۔''(33)

1857ء اور اس سے قبل کے یہ حالات بالکل جہاد کے متقاضی اور اس کی فرضیت کے محرک تھے۔انھیں حالات کو فقہا ''نفیرِ عام'' سے تعبیر کرتے ہیں اور ایسے ہی ناگزیر حالات میں ہر سچے اور بہی خواہِ انسانیت کا اولین فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ظلم وستم اور سفاکیت و بربریت کے جن خوگروں نے یہ حالات پیدا کیے ہیں، ان کے خلاف شمشیر وسنان کی جنگ چھیڑے اور اس وقت تک دم نہ لے جب تک کہ خدا کی مخلوق کو اس کے کھوئے ہوئے حقوق واپس نہ مل جائیں اور سکون وقرار کی زندگی بحال نہ ہو جائے۔

1857ء کے جہاد متقاضی حالات سے آگاہی کے بعد جہاد کے شرائط میں تین چیزیں باقی رہ جاتی ہیں۔سلطانِ اسلام کا وجود، فوج کی تعداد اور ساز وسامان و آلاتِ حرب کی کثرت کا ثبوت۔ہم ان تینوں کو بھی ترتیب وار ذکر کر رہے ہیں۔

سلطانِ اسلام: بیاسی سال کی عمر میں 28/دسمبر 1837ء کو اکبر ثانی اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا اور اس کی جگہ 30/دسمبر 1837ء مطابق 29/جمادی الاخریٰ 1252ھ کو خاندانِ تیمور کا آخری نام ور شہزادہ بہادر شاہ ظفر سریر آرائے سلطنت ہوا۔شاہی مسجد کے امام مولانا احمد علی نے رسمِ تاج پوشی ادا کی اور فوج وسپاہ نے سلامی دی۔(34)

بہادر شاہ ظفر ایک نیک کردار، روشن ضمیر، باکرامت، نورانی اور صوفی منش بادشاہ تھا۔(35) اور انگریزوں کا وظیفہ خوار ہونے کے باوجود اسے ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی اور ہندستانی عوام کے لیے اس کی شخصیت قابلِ تعظیم تھی اور یہ قدر ومنزلت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی نظر میں یکساں تھی۔(36)

فوج کی کافی تعداد: ہیرنشا ایک برٹش رائٹر ہے۔اس نے اپنی کتاب ''تاریخ کے اگر'' میں 1857ء کے وقت برطانوی اور ہندستانی فوجوں کی تعداد کے بارے میں لکھا ہے:

"There were in India at the time only 45000 British troops as against more than 250000 sepoys."

1857ء کے زمانے میں انڈیا میں برطانوی فوجیوں کی تعداد صرف 45/ہزار تھی جب کہ ہندستانی فوجیوں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے زیادہ تھی۔(37)

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی افسر بکار خاص رام پور رضا لائبریری لکھتے ہیں:

''جب جنگ کا آغاز ہوا تو ایک لاکھ سے زیادہ مجاہدین اس میں شامل تھے۔''(38)

4/ستمبر 1857ء کے روز نامچے میں جیون لال نے چند مخصوص راجاؤں کے نام ارسال کردہ شاہی مکتوب کے بارے میں لکھا ہے،جس میں فوج کی کثرت کا بھی ذکر موجود ہے۔

''شقہ بنام راجگان جے پور و جودھ پور و بیکانیر و الور و کوٹہ بدیں مضمون لکھے گئے کہ شاہ دہلی کے پاس جماعت کثیر فوج کی ہے اور دل سے چاہتے ہیں کہ انگریزوں کو نیست و نابود کر دیں مگر چوں کہ ہمارے پاس کوئی مدد تدبیر واسطے مملکت کے نہیں، لہذا چاہتے ہیں کہ تم آ کر انتظام ملک کا اپنی قدرت میں لو۔''(39)

سید عاشور کاظمی نے ''غداروں کے خطوط'' میں ''گھر کے چراغ سے'' کے عنوان سے انقلاب 1857ء کی تاریخ پر ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے،جس پر ہندستانی جنگ جوؤں کے بارے میں ان کا کہنا ہے:

''جنگ آزادی لڑنے والوں میں مختلف فوجی دستے شامل تھے جن میں میرٹھ کے سپاہیوں کے علاوہ ٹونک، نجف گڑھ، جھانسی، جھجر، حصار، سہارن پور، بریلی، نصیر آباد اور بنارس تک کے دستے شامل تھے۔گوالیار کے فوجی دستے بھی راجا کی مرضی کے خلاف مجاہدین سے آملے تھے۔''(40)

آلات کا اطمینان بخش ذخیرہ: 31/جولائی 1857ء میں ایک نامعلوم غدار نے کسی انگریز افسر کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں اس نے علی پور کے لیے روانہ ہونے والی فوج کے پاس موجود اسلحوں کی تفصیل اور مسلمانوں کی اسلحہ سازی کے بارے میں جاسوسی کی تھی:

فوج کے پاس جو اسلحہ موجود ہے اس کی تفصیلات یہ ہیں:

توپ کے گولے	50000
گولوں کے خول	20000
گولے	150
گول گولے	255
انگور نما گولے	150
بارود کے کنستر	125
گولوں کو داغنے کے چارجز	200

اس کے علاوہ ان کے پاس گھوڑوں سے کھینچی جانے والی بارہ توپیں، پیادہ فوج کی پانچ رجمنٹیں اور کیولری کی ایک رجمنٹ بھی ہے۔انھوں نے باغپت کے لیے چار اور توپیں بھیجنے کا بھی حکم دیا ہے۔ان کے پاس اس وقت گھوڑوں سے کھینچی جانے والی 31/توپیں ہیں۔محاصرہ توڑنے والی توپوں کی تعداد تو انگریزوں سے بھی زیادہ ہے۔بارود اور کارتوس کے چارجز بنانے کے لیے 250/مستری کام کر رہے ہیں۔ان کے پاس 400/من دیسی بارود کا ذخیرہ ہے۔جو بھی انگریزی بارود ان کے پاس بچا تھا وہ اب سلیم گڑھ میں مقیم 74 ویں رجمنٹ کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔کل جتنے بھی کارتوس بنے تھے وہ آج فوج میں تقسیم کر دیے گئے ہیں۔

کارتوسوں کی ٹوپیاں بنانے کے لیے کہا جا رہا ہے کہ بارود کے کارخانے کے ایک ملازم کلو مستری نے اعلیٰ نمونے کی ٹوپیاں تیار کی ہیں۔اس طرح شہر کے ایک داروغہ مظہر علی نے لوگوں کو داغنے کا مسالہ تیار کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔''(41)

قلعہ کے اندر ایک بڑا بارود خانہ تھا جس میں 520/بارود بنانے والے تھے۔(42) مولوی رجب علی جنگ شروع ہوتے ہی اپنی چرب زبانی اور عیاری سے بادشاہ کی مشاورتی کونسل کا رکن اور بارود خانے کا داروغہ بننے میں کامیاب ہو گیا تھا۔(43) یہ رجب علی انگریزوں کا جاسوس بھی تھا۔اس نے 7/اگست 1857ء کی شام کو بارود خانہ تباہ کر دیا، جس میں سارے بارود ساز ہلاک ہو گئے۔(44)

بازار خانم جو ایک بارونق بازار تھا، یہاں بھی ایک بہت بڑا بارود خانہ تھا۔جنگ کے دوران میں یہاں کے باشندوں نے آلاتِ حرب کی تیاری کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی اور دست کاری میں اپنے کمال کا مظاہرہ اس طرح کیا تھا کہ توپ کا گولہ، بندوق کی ٹوپی اور تفنگ کو بالکل انگریزوں جیسا بنا دیا تھا۔انقلاب 1857ء کے بعد انگریزوں نے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے اس بازار کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔(45)

عبد اللطیف 2/ذی قعدہ 26/جون 1857ء کی روداد میں لکھتا ہے:

''حافظ ندیم الدولہ بہادر محمد داؤد خاں نے عرض کیا کہ کوچہ چوڑی سازاں کا ہر شخص سرگرداں و پریشان ہے، کیوں کہ ان کا کوچہ موت کی نشانی بن گیا ہے اور وہ اس وجہ سے کہ اس کوچے کے ایک مکان کو بارود خانہ بنا دیا گیا ہے۔جب آبادی میں بارود بنائی جائے تو وہاں کے باشندوں کو آگ لگنے اور جل جانے کا اندیشہ کیوں نہ ہو؟ بادشاہ نے مرزا مغل کو حکم دیا کہ رعیت کا خیال کرو اور بارود بنانے کے لیے بستی کے باہر کوئی جگہ پسند کر لو۔''(46)

علی پور جو فوج بھیجی جا رہی تھی اس کی تاریخ 31/جولائی 1857ء تھی، جب کہ جنگ کا آغاز 11/مئی 1857ء کو ہو چکا تھا۔اس وقت اتنے سارے اسلحہ جات کے ساتھ فوج کو روانہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ہندستانی افواج کے پاس ساز وسامان و آلاتِ حرب کی قلت نہ تھی بلکہ یہ وافر مقدار میں اور متعدد انواع میں موجود تھے جیسا کہ درج بالا تاریخی اقتباسات سے معلوم ہوا۔ہاں! جنگ کے آخری دنوں میں قلعہ کے بارود خانہ کے جل جانے اور جنگ کے طول پکڑنے کی وجہ سے ان سامانوں کی قلت ضرور ہو گئی تھی، جس کا ذکر روز نامچوں میں بھی ملتا ہے، لیکن اس سے فتوائے جہاد پر کوئی حرف نہیں آتا ہے، کیوں کہ آغازِ جنگ میں فوج کی جو تعداد اور آلات کا جو ذخیرہ تھا وہ نہایت ہی اطمینان بخش تھا اور ظاہری اسباب کے طور پر جنگ میں غلبہ حاصل کرنے کا مکمل ضامن تھا۔

انقلاب 1857 کا نصب العین: جہاد کے لیے ضروری ہے کہ اس سے مقصد حصولِ اقتدار و دولت نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کی حاکمیت قائم کرنا اور فتنہ وفساد ختم کر کے اس دھرتی کو امن و سکون اور عدل وانصاف کا گہوارہ بنانا ہو۔ اس لیے یہاں ضروری ہے کہ انقلاب 1857ء کا مقصد معلوم کریں۔ جہاد کے نصب العین سے اس کی ہم آہنگی یا غیر ہم آہنگی کا پتہ چل سکے۔ اس کے لیے بہادر شاہ ظفر کا بیان سند کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے ہم بادشاہِ وقت کے دو بیان کو نقل کرتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر نے والیانِ ریاست کے نام جو خط بھیجا تھا، اس میں اس نے لکھا تھا:

''انگریزوں کو ملک سے نکال دینے کے بعد میرا مقصد ہندستان پر حکومت کرنے کا نہیں۔ اگر تمام راجے دشمن کو ملک سے نکالنے کے لیے تلوار نیام سے نکال لیں تو میں شاہی اختیارات اور طاقت سے دست بردار ہونے کے لیے رضامند ہو جاؤں گا۔''[47]

منشی جیون لال 2/ جولائی 1857ء کی روداد میں لکھتا ہے:

''شاہ دہلی نے فرمایا کہ میری منشا یہ ہے کہ انگریز نیست و نابود ہو جائیں اور شہر کی لوٹ موقوف کی جاوے۔''[48]

شاہی فرمان و بیان کے علاوہ ایک اور بیان ملاحظہ کریں جس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ روزِ آغاز ہی سے اس جنگ کا مقصد تحفظ مذہب اور خلقِ خدا کو امن وسکون کی خوش گوار فضا فراہم کرنا تھا۔ اس کے بیان کرنے والے پنڈت سندر لال جی ہیں جو تاریخ ہند کے ایک لائق و مستند اور مانے ہوئے مبصر ہیں، جن کی مشہور کتاب ''بھارت میں انگریزی راج'' کو ظالم انگریزوں نے ضبط کر لیا تھا اور پنڈت جی کو فیض آباد جیل میں بند کر دیا تھا۔ ایک دن چند قیدیوں سے گفتگو کے دوران پنڈت جی نے ایک راز سے پردہ اٹھایا اور کہا:

''مولوی علی احمد فیض آبادی جو عربی اسکول میں پڑھاتے تھے وہ روٹیاں اور کنول کا پھول تقسیم کیا کرتے تھے، جس کا مقصد یہ تھا کہ ہونے والی جنگ روٹی کے لیے ہے اور کنول کے پھول کا مطلب یہ ہے کہ مذہب بچاؤ۔ لہٰذا یہ ہونے والی جنگ ان دونوں مقاصد کے لیے لڑی جائے گی۔''[49]

یہ مضمون اللہ کے فضل سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ آخر میں ''دانش مندانِ وقت'' سے عرض ہے کہ 1857ء کے ظلم وستم اور جبر وتشدد پر مبنی یہ حالات، جہاں شرائطِ جہاد اپنے پورے کوائف کے ساتھ موجود تھے، ایسے سنگین اور جہاد متقاضی وقت میں کیا یہ دانش مندانہ اور حکیمانہ اقدام ہوتا کہ علمائے کرام حالات سے چشم پوشی کرتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے اور انسان نما شیطانوں کو مظلوم انسانوں کی زندہ لاشوں پر اپنی تجارت وسیاست کا شیش محل تعمیر کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتے۔ ذرا آج کے دانش مند سر جوڑ کر سوچیں اور پھر بتائیں۔

یہ حق ہے کہ 1857ء کے سیاہ، سخت گیر اور ابتر سے ابتر حالات چیخ چیخ کر جہاد کی ضرورت کا اعلان کر رہے تھے، جس کو اس وقت کے دانش ور اور زمانہ شناس علما نے سمجھ لیا تھا اور جہاد کا فتویٰ صادر کیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو یہ تعاون در بابِ ظلم وعدوان ہوتا جو سراسر ناجائز ہے۔

حوالے و حواشی

(1) مضمون سید عاشور کاظمی، غداروں کے خطوط، ص:37
(2) مضمون ڈاکٹر خلیق انجم (حرف آغاز) غداروں کے خطوط، ص:310
(3) روزنامچہ عبداللطیف مرتبہ خلیق احمد نظامی، ص:129
(4) مضمون عبدالشاہد خاں شیروانی (سوانح علامہ) باغی ہندوستان، ص:215
(5) ایضاً، ص:264 (6) ایضاً، ص:266
(7) اخبار الظفر سے منقول، بحوالہ تاریخ جنگ آزادی ہند اٹھارہ سو ستاون، تالیف: سید خورشید مصطفیٰ رضوی، ص:347-348
(8) ایضاً
(9) *Jacob: Western India, Savarkar, p:500-501*
(10) غداروں کے خطوط، تالیف: سید عاشور کاظمی، ص:182-183
(11) علما اور دورِ جدید، وحید الدین خاں، ص:20
(12) نقشِ حیات، 1954ء، جلد دوم، ص:42، بحوالہ علما اور دورِ جدید، وحید الدین خاں، ص:20
(13) تاریخ عروجِ سلطنتِ انگلشیہ، مولوی ذکاء اللہ، بحوالہ روزنامچہ عبداللطیف مرتبہ خلیق احمد نظامی، ص:192
(14) ہدایہ، جلد:2، ص:559
(15) تاریخ تحریک آزادی ہند، تاراچند، ص:442

......(باقی ص:36 پر)......

انقلاب 1857ء میں
سیاسی قائدین کا کردار

ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی

کسی بھی انقلابی تحریک کی کامیابی اس کے پر عزم اور فعال قائدین پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر قائدین میں ہمت وشجاعت، جاں بازی وجاں فروشی کے جذبات کے ساتھ عاقبت اندیشی، حکمت ودانائی اور نظم وضبط کی پابندی ہوگی، دیانت وامانت اور اصول وانصاف کا پاس ولحاظ ہوگا اور اپنے عوام و متبعین پر مکمل کنٹرول ہوگا تبھی تحریک کامیابی وکامرانی سے ہم کنار ہوگی اور مکمل انقلاب برپا کر سکے گی۔

ان ہی بنیادی اصولوں پر 1857ء کے چند اہم اور نمایاں قائدین کا احتساب مقصود ہے۔ لیکن اس سے قبل 1857ء کے انقلاب کی حقیقت وماہیت اور اس کے پس منظر کا جائزہ بھی ناگزیر ہے۔

رستاخیز 1857ء ——

عوام اور فوج کا برپا کردہ غدر تھا؟

ہندستانی فوجیوں اور سپاہیوں کی بغاوت تھی؟

جوش وجذبات اور بے سروسامانی کے عالم میں اٹھایا گیا ایک ایسا قدم تھا جس کا منطقی انجام ناکامی ہی تھا؟

ملک وقوم کو آزاد کرانے کے لیے پہلی جنگ آزادی تھی؟

یہ مختلف آرا ہیں جو گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں مختلف انداز سے پیش کی جاتی رہی ہیں اور ان کی مخالفت وموافقت میں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔

ان میں سے کوئی بھی رائے مکمل حقیقت کی ترجمانی نہیں کرتی، لیکن سبھی میں جزوی صداقت موجود ہے۔ حالات وواقعات اور قائدین وکردار کا غیر جانب دارانہ تجزیہ اسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔

اس بغاوت کے دوران افراتفری ولاقانونیت عام تھی، نظم وضبط کا فقدان تھا۔ مختلف علاقوں میں مختلف لوگوں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں اور صرف رسماً دہلی کی مرکزی حکومت کو تسلیم کیا تھا۔ یہ علاقائی حکومتیں بھی امن وامان اور حکومت وریاست قائم کرنے میں ناکام ہی تھیں تحریک میں شامل افراد ہی تحریک کی جڑیں کھود رہے تھے۔ دوست دشمن کی تمیز مشکل تھی۔ ہر جگہ انگریزوں کے جاسوس موجود تھے۔ بغاوت کے رہ نما حالات کو کنٹرول کرنے اور نظم وضبط قائم کرنے سے قاصر تھے۔ ملک کے بڑے حصے میں لوٹ مار، قتل وغارت گری اور بدامنی کا ماحول تھا۔ اس لیے اسے غدر کہا گیا تو ایک حد تک صحیح کہا گیا۔

اس کی ابتدا کمپنی کی فوج کے سپاہیوں اور فوجیوں نے کی تھی۔ ان کی بغاوت شدید امتیازی سلوک اور گائے وسور کی چربی لگے کارتوسوں کی وجہ سے تھی، جنھیں دانت سے کاٹ کر کھولنا اور استعمال کرنا پڑتا تھا۔ یورپین فوجی کے مقابلے میں ہندستانی فوجی کو سخت قسم کی نابرابری اور ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ حالاں کہ یہی وہ ہندستانی فوجی تھے جنھوں نے کمپنی کی حکومت قائم کرانے کے لیے اپنی قومی حکومتوں کا خاتمہ کرنے اور اپنے ہم وطنوں کو تہ تیغ کرنے میں کبھی تکلف نہیں کیا تھا۔ اب ان فوجیوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ انھوں نے سخت غلطی کی ہے۔ ان کی ناراضگی اس بغاوت کی بڑی وجہ تھی، اسی لیے اسے فوجی بغاوت سے تعبیر کیا گیا۔

یہ تحریک بغیر کسی معقول تیاری کے اور مقررہ وقت سے پہلے ہی محض جوش وجذبات اور بے سروسامانی کے عالم میں شروع کر دی گئی تھی۔ بغاوت کے رہ نما فوجی نظم وضبط، عاقبت اندیشی اور حکمتِ عملی و دانائی کے ویسے مظاہر پیش کرنے سے قاصر رہے جیسے کہ انگریزی فوجوں کے رہ نماؤں میں پائے جاتے تھے۔ آزادی پسندوں کے پاس نہ عمدہ ہتھیار تھے، نہ پیسہ۔ ان کی فوجیں انگریزی فوجوں کے مقابلے میں ہر حیثیت سے کم زور تھیں، اس لیے اس بغاوت اور تحریک کو ناکامی ونامرادی پر منتج ہونا تھا اور ویسا ہی ہوا۔

1857ء تک عام ہندستانیوں میں حبِ وطن، آزادی کی اہمیت اور قومی حکومت کا وہ تصور نہیں تھا جو آج پایا جاتا ہے۔ اس وقت حکومتِ وقت سے وفاداری اور آقا کی نمک حلالی کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔

D-59 میڈیکل کالونی۔ اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ

گزشتہ کئی صدیوں کی بدامنی وبدانتظامی اور شخصی حکومتوں کی بے اعتدالیوں کے مقابلے میں عام لوگوں کو کمپنی کی حکومت بہت غنیمت محسوس ہوتی تھی، جس نے بہر حال امن وامان اور نظم وضبط قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ پھر بھی کچھ بیدار مغز اور محبِ وطن ہندستانی اپنے ملک و قوم کو سات سمندر پار سے آئے ہوئے تاجروں کے پنجۂ استبداد اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے اور اپنے دین و مذہب کی حفاظت کے لیے مخلصانہ کوشش کرنے پر آمادہ تھے۔ ان لوگوں نے اپنے جان و مال کی بے پناہ قربانیاں پیش کر کے شمعِ آزادی کو روشن رکھنے کی سعی کی۔ اسی لیے ان کی جد و جہد کو پہلی جنگِ آزادی تسلیم کیا جاتا ہے اور بجا طور پر کیا جاتا ہے۔

در اصل 1857ء اور اس کے تقریباً نصف صدی بعد تک انگریزوں اور ان کے ہم نواؤں نے اس جد و جہد کو اس قدر شد و مد اور تواتر کے ساتھ 'غدر' کہا کہ عوام و خواص کی نوکِ زبان پر اس کے لیے 'غدر' کا لفظ ہی آتا تھا۔ یہاں تک کہ جد و جہدِ آزادی کے دورِ عروج میں اسے ہندستان کی پہلی جنگِ آزادی کہا جانے لگا۔ انصاف پسند انگریز اور دوسرے یورپین مورخین نے بھی اسے قومی آزادی کے لیے برپا کی جانے والی بغاوت اور جنگِ آزادی تسلیم کیا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس جد و جہد میں شاہانِ وقت، نوابین، راجاؤں، جاگیر داروں و زمین داروں، امرا و رؤسا، علما و عوام، شہریوں اور فوجیوں، سبھی نے حصہ لیا۔ جان و مال کی بے مثال قربانیاں پیش کیں اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی لیکن اسی کے ساتھ بدقسمتی سے انگریزوں کے کاسہ لیسوں اور ہوا خواہوں، نیز ملک و قوم کے غداروں کی بڑی تعداد ہر جگہ موجود تھی، ہر گام پر ان کا ساتھ دے رہی تھی، انھیں بروقت خبریں پہنچا رہی تھی اور ہر ممکن طریقے سے انگریزی حکومت کو واپس لانے کے لیے آزادی خواہوں کی پشت میں خنجر بھونک رہی تھی۔

کمپنی کی حکومت کے مظالم، دیسی ریاستوں کے خاتمے یا انھیں بے دست و پا بنانے، ہندستانیوں کے سماجی رسم و رواج میں مداخلت اور ان کے خاتمے کی کوششوں اور ہندستانیوں کو عیسائی بنانے کی منصوبہ بندیوں کے خلاف عام ہندستانیوں میں بہت غم و غصہ تھا اور وہ کمپنی کی حکومت کے خاتمے کی تدابیر کے لیے باہمی اتحاد و یک جہتی کو ضروری خیال کرتے تھے۔ کچھ خفیہ جماعتیں انگریزی اقتدار کے خاتمے اور مکمل انقلاب کے لیے کوشاں تھیں۔ اسی سلسلے میں 1857ء کی ابتدا میں فوج اور عوام میں پر اسرار قسم کی چپاتیاں اور کنول کے پھول بہ طور نشانی تقسیم کیے گئے تھے۔ نانا صاحب مولوی احمد اللہ شاہ اور عظیم اللہ خاں نے خاموشی سے ملک کے دور دراز علاقوں کا سفر کر کے انقلاب کی فضا ہم وار کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے مولوی، پنڈت، فقیر اور سادھو سنیاسی بغاوت کے بیج بونے میں مصروف تھے۔ با اثر علما جہاد کی اہمیت و فضیلت پر جگہ جگہ وعظ کہہ رہے تھے۔ مگر یہ سب سرگرمیاں اس قدر خاموشی سے جاری تھیں کہ انگریزوں کو اس کی بھنک بھی نہ لگ سکی۔ یہاں تک کہ بغاوت کے لیے 31/مئی 1857ء کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ 31/مئی کو ہندستان کی تمام چھاؤنیوں میں ایک ساتھ بغاوت کی جائے گی اور عوام فوج کے شانہ بہ شانہ انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

میرٹھ چھاؤنی میں 10/مئی کو چربی لگے کارتوس نہ کاٹنے پر 85/ہندستانی افسران کا کورٹ مارشل کر کے بری طرح ذلیل و رسوا کیا گیا اور انھیں زنجیروں سے باندھ کر جیل روانہ کر دیا گیا۔ ہندستانی سپاہی اس منظر کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے وقت مقررہ سے قبل ہی اسی دن بغاوت کر دی، قید سے اپنے ساتھیوں کو رہا کروایا اور انگریزوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ میرٹھ میں انگریزوں اور ان کے اقتدار کا خاتمہ کر کے یہ فوجی ۱۱/مئی کو دہلی پہنچے اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے تحریک کی رہ نمائی کی درخواست کی۔ دہلی میں بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوگئی۔ جلد ہی قرب و جوار کے اضلاع، بلند شہر، علی گڑھ، بریلی، مراد آباد، بجنور، آگرہ وغیرہ تک بغاوت کے شعلے پہنچ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شمالی ہند کے بیش تر علاقوں سے انگریزی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ دہلی کے علاوہ روہیل کھنڈ، بندیل کھنڈ، بہار اور وسطی ہند میں جنگِ آزادی کا بگل بج اٹھا۔ مختلف شہروں، قصبوں اور گاؤں میں انگریزی حکومت کے نام و نشان کو مٹا دیا۔

یوں تو ہر علاقے، شہر اور قصبے میں وہاں کے سربر آوردہ حضرات نے اس جنگ کی باگ ڈور سنبھال لی تھی اور آزادی کے متوالوں کی قیادت کو اپنا فریضہ سمجھا تھا، لیکن مندرجہ ذیل قائدین نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس مقالے میں دس قائدین کا انتخاب کیا گیا ہے، جن کی سیاسی قیادت نے تحریک کو حرکت و عمل کی قوت عطا کی اور تحریک کو ایک خاص سمت و رفتار تک پہنچایا۔ ان میں سے پانچ

قائدین کا تعلق شاہی خاندانوں سے ہے اور بقیہ پانچ اپنی اہمیت و صلاحیت کی بنا پر اس تحریک کے صفِ اول کے قائدین میں شامل ہوئے۔ شاہی خاندانوں کے افراد تھے، اودھ میں بیگم حضرت محل، بندیل کھنڈ اور وسطی ہند میں نانا صاحب اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے شمعِ آزادی کی حفاظت کا حق ادا کیا۔ شاہی خاندان کے افراد میں مغل شہزادہ فیروز شاہ بھی اپنے قابلِ ذکر کارناموں کی بدولت اس فہرست میں شامل ہونے کا حق دار ہے۔

شاہی خاندان سے باہر جنگ آزادی کو مہمیز کرنے اور انگریزی افواج سے لوہا لینے کے معاملہ میں سرِ فہرست جنرل محمد بخت خاں تھے۔ بریلی اور روہیل کھنڈ میں خان بہادر خاں نے نمایاں کردار ادا کیا، خان بہادر خاں روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں کے خاندان کے ایک فرد تھے۔ جنرل بخت خاں کا تعلق بھی روہیلہ پٹھانوں سے ہی تھا۔ اس قبیلہ کے ایک فرد نواب محمود خاں نے ضلع بجنور میں دادِ شجاعت دی اور شمعِ آزادی کو روشن رکھنے کی کوشش کی۔ مولوی احمد اللہ شاہ اور عظیم اللہ خاں جنگِ آزادی کے دو نام ور فرزند ہیں، جنھوں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ ان کی اہلیت و صلاحیت اور حکمت و دانائی کو اغیار نے بھی خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جنرل بخت خاں اور ان دونوں حضرات کو اگر خاندانی پس منظر حاصل ہوتا تو یقیناً کامیابی و کامرانی ان کے قدم چومتی، لیکن ان کی کامیاب سیاسی قیادت میں شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔

ابو الظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ اس عظیم مغلیہ سلطنت کے آخری چشم و چراغ تھے جس کا پرچم کبھی برصغیر کے بیش تر علاقوں پر لہراتا تھا، لیکن اب صرف دہلی کے لال قلعہ پر آویزاں تھا اور وہاں سے بھی اترنے کا منتظر تھا۔ بابر سے اورنگ زیب تک حکمراں کشور کشا تھے، میدانِ جنگ میں خود دادِ شجاعت دیتے تھے، حکومت و سیاست اور امرا و رؤسا پر مکمل کنٹرول رکھتے تھے۔ میدانِ رزم کے شہ سوار اور بزمِ عیش و نشاط کے صدر نشین ہوتے تھے۔ اورنگ زیب کے بعد زوال و ادبار نے گھر دیکھ لیا۔ اورنگ زیب کے بعد ہونے والے سبھی بادشاہ اور جانشین نکمے اور ناکارہ ثابت ہوئے۔ سبھی رزم سے دور اور بزم کے دل دادہ رہے۔ بہادر شاہ ظفر اس زنگ آلود زنجیر کی آخری کڑی تھے، اس لیے ان کا کم زور ثابت ہونا فطری و بدیہی تھا۔ وہ اپنے تخلص اور کنیت کے برعکس ابو شکست ہی رہے۔ یوں شخصی و ذاتی حیثیت سے وہ بہت اچھے انسان تھے۔ خدا ترسی، رحم دلی اور شرافت نفس ان میں بہ درجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ وہ ایک درد مند دل کے انسان اور بہترین شاعر بھی تھے۔ اس لیے ان کا کلام سوز و گداز اور درد مندی سے عبارت ہے۔ انھوں نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جہاں ہر طرف عیش و نشاط اور بزم آرائی کا چرچا تھا۔ ان کے اور ان کے اہلِ خاندان کے پاس تلواریں تو تھیں لیکن ان کی دھار کبھی کی کند ہو چکی تھی۔ ان کی انگلیاں طاؤس و رباب پر تو چل سکتی تھیں لیکن شمشیر و سناں سے لرزتی تھیں۔ بادشاہ اور اہلِ قلعہ انگریز حکومت کے اسیر تھے، لیکن بدترین قسم کی سازشوں اور رقابتوں کا شکار تھے۔ ظفر کے کئی بیٹے اس ولی عہدی کے لیے بے چین تھے، جس کا وجود ہی خطرے میں تھا۔ ان کی نظر ولی عہدی، پنشن میں اضافے اور محفلِ رقص و سرود سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے ہی حال میں مست تھے۔ لیکن بایں ہمہ عوام کی نظروں میں اب بھی محترم، شاہِ ہند اور مرکزی شخصیت تھے۔ اس لیے میرٹھ کے باغیوں نے دہلی کا رخ کر کے ان کی برائے نام شاہی کو حقیقی شاہی میں بدلنے کی کوشش کی اور ملک و قوم کی جنگ آزادی و سرداری کا تاج ان کے سر پر رکھا۔ ظفر اس وقت 82/سال کے ضعیف و ناتواں شخص تھے۔ انھوں نے مدت العمر میں کبھی جنگ و جدال نہیں دیکھا تھا۔ وہ کیا ان کے باپ دادا بھی کمپنی کے پنشن پر دادِ عیش دیتے رہے تھے۔ ان کے شہزادگان بھی ایک سے بڑھ کر ایک نکمے، ناکارہ اور انقلاب و جنگ کی حکمتِ عملی سے بے خبر تھے۔ اب اگر ایسے لوگوں کو کسی بڑی تحریک کی قیادت اور جنگ کی کمان سونپ دی جائے تو اس کا انجام اول روز ہی عالم آشکارا ہوگا۔ لیکن بد قسمتی یہی ہوئی کہ ان کی خاندانی وجاہت اور مرکزیت نے قیادت و سیادت کا حق دار انھیں کو بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرکز ہی اپنی آزادی اور حکومت کو چار ماہ سے زیادہ برقرار نہ رکھ سکا۔ ان چار مہینوں میں بھی ہر طرف بدامنی، لوٹ مار، قتل و غارت گری کا ہی راج رہا۔ بہادر شاہ چاروں طرف سے انگریزوں کے ہوا خواہوں اور جاسوسوں سے گھرے ہوئے تھے جو ان کی ایک ایک خبر انگریزوں تک پہنچا رہے تھے۔ بادشاہ دوست دشمن میں تمیز کرنے اور صحیح مشورے کو قبول کرنے سے قاصر تھا۔ بہادر شاہ اور ان کے شہزادگان آزادی خواہوں اور ان کی افواج کو قیادت دینے سے پوری طرح ناکام رہے۔ پس ان حالات کا جو

انجام ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔

اودھ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی اور جنگ آزادی میں بہت ہی نمایاں کردار ادا کرنے والی اہم شخصیت بیگم حضرت محل کی تھی جنھوں نے اودھ میں اپنی شجاعت و دانائی اور حکمت عملی سے تقریباً ایک سال تک انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیے اور شمع آزادی کو گل ہونے سے بچائے رکھا۔

قدرت نے بیگم حضرت محل کو جہاں بانی و جہاں گیری کی صلاحیت تو عطا کی تھی لیکن ان کے مواقع سے محروم رکھا تھا۔ بچپن اور جوانی میں انھیں رقص وسرود کی تعلیم دی گئی تھی تاکہ حسن صورت کے ساتھ اس "حسن عمل" سے اپنے عیاش شوہر کا دل بہلا سکیں، لیکن پہلی جنگ آزادی کے موقع پر ان کی پوشیدہ صلاحیتیں، اولوالعزمی، ہمت و جرأت، شجاعت ودانائی عود کر آئیں اور انھوں نے ان کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ لیکن بدقسمتی یہاں بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ سپاہ وافواج نظم وضبط سے عاری تھیں۔ دشمن کے جاسوس چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور گم راہ کر کے نہ صرف نقصان پہنچانے پر آمادہ تھے بلکہ خبریں اور راز انگریزوں تک پہنچا رہے تھے۔ باہمی رقابتوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا لامتناہی سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ بے حسی اور بے غیرتی نے قومی نفع ونقصان سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اپنے وقتی فائدے اور ذرا سے لالچ کے لیے ملک وقوم کو نقصان پہنچانے میں بھی عار نہ تھا۔ غرض کہ انتہائی نامساعد حالات میں صرف اپنی ذاتی صلاحتیوں کی بدولت بیگم کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں اور نہ ہو سکیں۔

مولانا عبد الحلیم شرر نے اس وقت کے حالات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"لوگ حضرت محل کی مستعدی اور نیک نفسی کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتی اور ان کے کام اور حوصلے سے زیادہ انعام دیتی تھیں مگر اس کا کیا علاج کہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود پردے سے نکل کر فوج کی سپہ سالاری کرتیں۔ مشیر اچھے نہ تھے اور سپاہی کام کے نہ تھے۔ ہر شخص غرض کا بندہ تھا اور کوئی کسی کا کہنا نہ مانتا تھا۔" (ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص:59)

غلام رسول مہر نے بیگم حضرت محل کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس نے وہ کام کر دکھایا جو اس کے بااختیار شوہر سے نو سال کی شاہانہ زندگی میں نہ ہو سکا۔ کامیابی یا ناکامی سے بحث نہیں لیکن مجاہدین آزادی کے لیے حضرت محل نے عمل کا ایک نہایت قابل قدر نمونہ تو پیش کر دیا، یہ تو بتا دیا کہ عورت کی زندگی بسر کرنے کے ڈھنگ کیا ہوتے ہیں۔ وہ عورت تھی، پردہ دار عورت۔ رزم و پیکار کے آداب وفنون سیکھنے کا اسے کوئی موقع نہ مل سکا تھا، لیکن خدا نے اس کے پہلو میں ایک ہمت ور دل رکھ دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ غیرت و حمیت کے تقاضے کیا ہیں ______ حضرت محل نے پردے میں بیٹھے بیٹھے بھی وہ کارنامہ سر انجام دیا جس کی توفیق مردوں میں سے بھی تھوڑوں ہی کو ملی۔"

(1857 کے مجاہد، ص:18 کتاب منزل، لاہور)

بیگم حضرت محل کے کردار کی ایک بڑی خوبی جو زبردست تاثر چھوڑتی ہے وہ ان کی غیر معمولی غیرت وحمیت ہے۔ جنگ کے دوران بھی اور اس کے بعد بھی انگریزی حکومت نے معقول وظیفہ اور عزت واحترام دینے کے وعدے کیے اور لکھنؤ یا فیض آباد میں رہنے کی پیش کش کی لیکن اس غیور مجاہدہ نے متواتر اکیس سال عالم غربت وعسرت میں بسر کیے۔ انھوں نے عمر کا بقیہ حصہ نیپال میں گزارا، لیکن انگریزی عمل داری میں رہنا اور انگریزی حکومت کا وظیفہ پانا قبول نہیں کیا۔ اسی لیے مورخین ان کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

جھانسی کی رانی لکشمی بائی 1857ء کے ان قائدین میں سے ہے جس نے شمع آزادی کی حفاظت کے لیے اپنی جان عزیز بھی قربان کر دی تھی۔ اس کی ہمت، بہادری اور دلیری کو انگریز مورخین نے بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس نے جھانسی اور وسطی ہند کے علاقوں کو نہ صرف سیاسی قیادت فراہم کی تھی بلکہ میدان کارزار میں بھی انگریزی فوجوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ گھڑ سواری اور شمشیر زنی میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔ اس نے متعدد معرکوں میں انگریزی فوجوں کو شکست سے دوچار کیا۔ جھانسی کی حفاظت میں اس کی بے مثال جدوجہد اور قربانیاں مثال میں پیش کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مقامی لوک گیتوں میں اس کی بہادری کی داستان آج بھی بڑے شوق اور دل چسپی سے

گائی اور سنی جاتی ہے ۔

بندیلے ہر بولوں کے منہ ہم نے سنی کہانی تھی
خوب لڑی مردانی وہ تو جھانسی والی رانی تھی

یہ بول آج بھی سننے والوں کے جسم میں حرارت اور زندگی پیدا کر دیتے ہیں۔

17 رجون 1858ء کو ایک زبردست معرکہ میں وہ بری طرح زخمی ہوئی۔ اسے قریب کی ایک جھونپڑی میں لے جایا گیا، جہاں زخموں کی تاب نہ لا کر اس نے اپنی جان وطن عزیز پر قربان کر دی۔ اس کے وفادار ملازمین اور ساتھیوں نے وہیں گھاس کا ڈھیر لگا کر اس کے جسد خاکی کو نذر آتش کر دیا تاکہ انگریز اس کے مردہ جسم کو بھی ہاتھ نہ لگا سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ بھلے ہی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی ہو، لیکن اس نے ہندوستان کی اس پہلی جنگ آزادی میں بہترین سیاسی وعسکری قیادت فراہم کی۔

1857ء کی جنگ آزادی کے اہم رہنماؤں میں نانا صاحب کا نام بھی بہت نمایاں ہے۔ ان کا پورا نام ڈھونڈو پنت نانا صاحب تھا۔ یہ مرہٹوں کے آخری پیشوا باجی راؤ ثانی کے متبنٰی بیٹے تھے، جسے انگریزوں نے پونا کی حکومت سے برطرف کر کے کانپور کے پاس بٹھور میں لا بسایا تھا اور جاگیر و وظیفہ دے کر فکر دنیا سے آزاد کر دیا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے متبنٰی بیٹے کو جاگیر اور وظیفے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس لیے انگریزوں کے خلاف اس کے دل میں غم وغصہ ہونا فطری بات تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے عظیم اللہ خاں کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف بغاوت کا ایک وسیع منصوبہ بنایا تھا۔ مئی 1857ء میں بغاوت شروع ہونے کے بعد اس نے کچھ دن مزید انتظار کیا، بالآخر وہ بھی اپنے تمام تر اثر ورسوخ اور قوت کے ساتھ آزادی پسندوں میں شامل ہو گیا۔ مشہور مجاہد آزادی تانتیا ٹوپے اس کا دست راست تھا اور عظیم اللہ خاں اس کے خصوصی معاون ومشیر تھے۔ نانا صاحب نے بیگم حضرت محل اور رانی لکشمی بائی کے ساتھ اشتراک وتعاون کیا اور اودھ، بندیل کھنڈ اور روہیل کھنڈ میں دوسرے مجاہدین کے ساتھ مل کر داد شجاعت دی۔ تحریک کی ناکامی کے بعد وہ بھی بیگم حضرت محل کی طرح نیپال چلے گئے اور آخر تک وہیں رہے۔

تحریک بھلے ہی ناکام رہی ہو، لیکن نانا صاحب کے کارنامے اس تحریک اور ہندوستان کی تاریخ کے اس باب میں زریں حروف میں چمکتے رہیں گے۔

شاہی خاندانوں کے جن افراد نے جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا اور اپنی سیاسی وعسکری قیادت سے تحریک کو جلا بخشی، ان میں شہزادہ فیروز شاہ کا نام بھی بہت نمایاں ہے۔ شہزادہ موصوف خاندان مغلیہ کے چشم و چراغ تھے، شہنشاہ فرخ سیر کے نواسے تھے لیکن عام مغل شہزادوں کے برعکس محنتی، بہادر، دلیر اور مذہبی رجحان کے حامل تھے۔ 1856ء میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ حج کے لیے گئے۔ 1857ء میں واپس آئے تو یہاں آزادی کے لیے معرکۂ کارزار گرم تھا۔ سورت کی بندرگاہ سے یہ وسط ہند میں پہنچے اور شریک جنگ ہوئے۔ وہاں کی منتشر افواج نے انھیں اپنا رہنما بنا لیا۔ انھوں نے بھی کامیاب قیادت عطا کی۔ مختلف معرکوں میں حصہ لیتے ہوئے یہ دہلی کی طرف روانہ ہوئے، لیکن راستے میں ہی سقوط دہلی کی خبر ملی تو آگرے کا رخ کیا، وہاں سے متھرا ہوتے ہوئے اودھ جا پہنچے اور بیگم حضرت محل سے تعاون کیا۔ جب وہاں بھی حالات ناسازگار ہو گئے تو مجاہدین روہیل کھنڈ کے تعاون کے لیے وہاں پہنچ گئے۔

جب تحریک ہر جگہ ناکام ہو گئی تو شہزادہ فیروز شاہ نے خود کو اس طرح گوشۂ عزلت میں داخل کیا کہ باوجود کوشش بسیار کے انگریز ان کا سراغ نہ پا سکے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ملک سے باہر کابل وقندھار ہوتے ہوئے روسی ترکستان چلے گئے۔ کچھ لوگوں نے حجاز مقدس میں ان کا ہونا ثابت کیا ہے۔ 1859ء تک انھیں دیکھا گیا تھا لیکن اس سلسلے میں صحیح معلومات کا فقدان ہی رہا۔ بہر حال یہ بھی ان کی حکمت عملی کا کمال اور غیرت وحمیت پر دال ہے کہ انھوں نے تحریک کی ناکامی پر خود کو اس طرح چھپایا کہ دوست دشمن کوئی بھی ان کا سراغ نہ پا سکا، البتہ جنگ آزادی میں ان کے سنہری کارنامے تاریخ کے اوراق کی زینت ہیں۔

شاہی خاندان کے افراد کے علاوہ جن لوگوں نے اپنی ذاتی قابلیت، اہلیت وصلاحیت، شجاعت و تدبر اور اولوالعزمی کی بدولت پہلی جنگ آزادی اور اس کی تحریک میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور اپنے نام و کام کو شہرت عام وبقائے دوام کی سند دلائی، ان میں سرفہرست نام جنرل محمد بخت خاں کا ہے۔ ان کا تعلق ان روہیلہ پٹھانوں سے تھا جنھوں نے اپنی شجاعت اور اولوالعزمی سے ایک علاقے کو روہیل کھنڈ

کا نام دلایا اور اپنی آزاد ریاستیں قائم کیں۔ روہیلوں کی بربادی کے بعد ان کا خاندان سلطان پور میں جا بسا تھا۔ محمد بخت خاں نے کمپنی کی فوج میں ملازمت اختیار کی اور اپنی بہادری اور صلاحیت کی بدولت جلد ہی ترقی کی منزلیں طے کیں۔ انگریزی فوج کے توپ خانے میں صوبے دار کا عہدہ حاصل کر لیا جو کسی ہندستانی کے لیے ایک بڑا عہدہ تھا۔ انھوں نے انگریزی فوجوں کی طرف سے جنگِ افغانستان میں بھی حصہ لیا تھا۔

1857ء میں بغاوت کے آغاز کے وقت وہ بریلی میں تعینات تھے۔ وہاں خان بہادر خاں کی حکومت قائم کرا کے ایک بڑی فوج، توپ خانے اور کافی روپیہ کے ساتھ وہ دہلی پہنچے۔ جلد ہی انھوں نے بہادر شاہ ظفر کا اعتبار و اعتماد حاصل کر لیا۔ انھیں تمام افواج کا سپہ سالار اور گورنر بنایا گیا۔ دہلی کا انتظام و انصرام بھی انھیں کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کے بعد دہلی میں امن و انتظام قائم ہوا ورنہ اس سے قبل تقریباً دو مہینے افراتفری، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا ماحول رہا تھا۔ اس نے بے لگام فوجوں کو نظم و ضبط کا پابند بنایا اور جدید طریقوں سے جنگ کی۔ انگریزی افواج کے سالار بھی ان کی جنگی صلاحیت کا لوہا مانتے تھے۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ مغل شہزادے جنھیں بڑے بڑے عہدے دیے گئے تھے، اس کام میں روڑا اٹکاتے تھے۔ قلعہ انگریزوں کے جاسوس سے بھرا ہوا تھا اور وہ اس کی منصوبہ بندی کی خبریں انگریزوں کو پہنچا رہے تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بخت خاں ایک ایسا لائق افسر تھا کہ اگر اس کے کاموں میں مزاحمت نہ کی جاتی تو وہ آخری زمانے کا سب سے بڑا فاتح ہوتا اور ہندستان کا بچہ بچہ اس کے نام پر فخر کرتا۔'' (غدر کی صبح و شام، ص:7)

یہی خواجہ صاحب ''دلی کی جاں کنی'' میں اس کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

''قسمت نے بخت خاں کو ناکام رکھا ورنہ عجب نہیں تھا کہ وہ ہندستان کا تاج دار بن جاتا اور انگریزوں کو ملک سے خارج کر کے تیموریوں کی کم زور ہستی کو بھی درمیان سے دور کر دیتا اور دوسرا شیر شاہ تاریخوں میں لکھا جاتا۔'' (دلی کی جاں کنی، ص:50)

سقوطِ دہلی کے بعد بھی اس نے بہادر شاہ کو ہر طرح سمجھایا۔ بابر، ہمایوں اور اکبر کی اولوالعزمی کی مثالیں دیں۔ مگر بہادر شاہ ان پر عزم بادشاہوں کے وارث ضرور تھے لیکن ان جیسی بہادری اور عزم و ہمت سے تہی دامن تھے۔ وہ بخت خان کے ساتھ اودھ اور روہیل کھنڈ کی طرف جانے پر راضی نہیں ہوئے۔ مجبوراً بخت خاں اپنی فوج کے ساتھ دہلی سے نکل کر اودھ اور پھر روہیل کھنڈ میں شمعِ آزادی کی حفاظت میں لگا رہا اور جب ہر طرف سے مایوسی ہوگئی تو ایسا غائب ہوا کہ تلاش بسیار کے باوجود اس کا سراغ نہ مل سکا۔

حقیقت یہی ہے کہ وہ ایسا مدبر اور لائق قائد تھا کہ اگر اسے سازگار ماحول مل جاتا تو وہ تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیتا۔ لیکن قضا و قدر کے فیصلوں کے آگے سبھی مجبور و بے بس ہو جاتے ہیں۔

روہیل کھنڈ کے مرکز بریلی میں جب انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑکے اور انگریزوں کو وہاں سے بھاگنا پڑا تو اس وقت بریلی کی سب سے مقتدر شخصیت خان بہادر خاں کی تھی۔ یہ مشہور روہیلہ سردار حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں کے پوتے اور خود بھی تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت تھے۔ خان بہادر خاں کمپنی کی حکومت میں برس ہا برس تک صدر الصدور رہے تھے۔ کمپنی کی حکومت کے خاتمے کے بعد بریلی اور روہیل کھنڈ کی حکومت و اختیار انھیں کے ہاتھ میں آیا۔ انھوں نے تقریباً ایک سال تک آزادی پسندوں کی قیادت کی اور روہیل کھنڈ کا انتظامِ حکومت چلایا۔

جب انگریزی فوجیں چاروں طرف سے یورش کرتی ہوئی روہیل کھنڈ پہنچیں اور ان کا مقابلہ مشکل ہو گیا تب خان بہادر خاں میدانِ جنگ سے نکل کر پیلی بھیت جا پہنچے اور انگریزوں کے خلاف کارروائیاں کرتے رہے۔ نیپال کے سرحدی علاقے کی ایک جھڑپ میں وہ گھوڑے سے گرے اور گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں گرفتار کر کے لکھنؤ لے جایا گیا۔ وہیں مقدمہ چلایا گیا اور پھر بریلی لا کر وہاں کوتوالی کے سامنے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں ان کا مزار زیارت گاہ نہ بن جائے، ضلع جیل کے اندر دفن کیا گیا، لیکن اس شہیدِ وطن کا مزار پوشیدہ نہ رہ سکا۔ آج بھی اس پر عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کیے جا رہے ہیں۔

تحریکِ آزادی کے قائدین میں ایک اہم نام نواب محمود خاں کا بھی ہے، جنھوں نے بجنور، نجیب آباد اور ان کے اطراف و جوانب

میں جنگِ آزادی کی کامیاب قیادت کی۔ ان کا نسبی تعلق مشہور روہیلہ سردار نواب نجیب الدولہ سے تھا۔ یہ ان کے پرپوتے تھے۔ ریاست و امارت کے کچھ اثرات بہرحال باقی تھے، اس لیے رئیسانہ انداز سے زندگی بسر کرتے تھے۔ سیر و شکار اور عیش و نشاط ان کے مشاغل تھے۔ لیکن جب 1857ء میں جنگِ آزادی کا بگل بجا تو یہ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ ضلع بجنور میں تحریک کی قیادت انھیں کے حصے میں آئی۔ انھوں نے نظمِ حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ انگریزی حکومت کے منصف سید احمد خاں اور ڈپٹی رحمت خاں کو اپنے ساتھ شامل کیا۔ یہ دونوں بہ ظاہر نواب کے ہم درد اور مشیر بن گئے لیکن در پردہ انگریزوں سے ملے رہے۔ نواب کی حکومت کو نقصان پہنچانے، باہمی منافرت پھیلانے اور انگریزی حکومت کو دوبارہ قائم کرانے میں کوشاں رہے، اس لیے نواب محمود خاں اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جب تحریکِ آزادی ہر جگہ ناکام ہو گئی تو پھر ضلع بجنور ہی کیوں کر بچ سکتا تھا۔ انگریزی افواج کی یورش کے سامنے آزادی خواہوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ نواب محمود خاں گرفتار ہوئے۔ انھیں حبس دوام بہ عبور دریاے شور (کالا پانی) کی سزا ہوئی۔ لیکن وہاں بھیجے جانے سے قبل ہی جیل میں ان کا انتقال ہو گیا۔

شاہی خاندان اور فوج سے تعلق رکھنے والی مندرجہ بالا شخصیات کے علاوہ دو اور قابلِ ذکر شخصیات، جنھوں نے اپنے تدبر و دانائی سے تحریکِ آزادی کو جلا بخشی، اس کی منصوبہ بندی کی، عوام و خواص کو تحریک سے جوڑنے، متحد و منظم ہو کر کام کرنے پر آمادہ کیا۔ مولوی سید احمد اللہ شاہ اور عظیم اللہ خاں کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں تحریک کے دل و دماغ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

مولوی سید احمد اللہ شاہ مدراسی (1788ء-1858ء) وہ اہم شخصیت ہیں جنھوں نے ملک کے طول و عرض میں گھوم پھر کر انگریزی حکومت کے خلاف منصوبہ بندی کی تھی۔

سید خورشید مصطفیٰ رضوی نے لکھا ہے:

''تحریک 1857ء کے لیے پورے ملک کو تیار کرنے میں مولانا شاہ احمد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ وہ ملک کے گوشے گوشے میں دورہ کر کے عوام کو بغاوت کے لیے آمادہ کر رہے تھے۔ نیلسن نے لکھا ہے:

بے شک اس تمام سازش کا رہ نما مولوی (احمد اللہ شاہ) تھا اور یہ سازش تمام ہندستانیوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ یقینی طور پر آگرہ، جہاں اس مولوی نے کچھ عرصہ قیام کیا تھا اور دہلی، میرٹھ، پٹنہ اور کلکتہ وغیرہ سازش کے مرکز تھے۔ مولانا احمد اللہ شاہ نے جو خط و کتابت کی اس کا تذکرہ فیض آباد میں ان کی گرفتاری کے وقت سرکاری کاغذات سے ملتا ہے، جن میں لکھا ہے کہ جب مولوی کی تلاشی لی گئی تو متعدد خطوط برآمد ہوئے، جن سے اس سازش پر روشنی پڑتی تھی۔''

شاہ صاحب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ ان کی حکومت سے کوئی غرض یا خصومت نہیں تھی۔ نہ ان کی ریاست ضبط ہوئی تھی، نہ پنشن۔ اس لیے انھوں نے جو کچھ کیا وہ صرف ملک و قوم اور دین و مذہب کی آزادی کے لیے تھا۔ انھوں نے بیگم حضرت محل کے ساتھ اودھ میں اور پھر روہیل کھنڈ میں بھی معرکۂ کارزار میں حصہ لیا اور دادِ شجاعت دی۔ ان کی جنگی حکمتِ عملی کو میلی سن نے بھی ہنرمندانہ تسلیم کیا ہے۔
(دیکھیے جلد چہارم ص:240-241)

اس تحریک میں ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے ان کی گرفتاری یا سر پر پچاس ہزار روپیہ کا انعام رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں یہ بہت بڑی رقم تھی۔

اودھ اور بندیل کھنڈ کی سرحد پر واقع ایک چھوٹی سی ریاست پوائیں کا راجا جگناتھ سنگھ اور اس کا بھائی بلدیو سنگھ اس انعام کے لالچ کا شکار ہوئے۔ بہ ظاہر یہ آزادی پسندوں کے ساتھ تھے لیکن انھوں نے دھوکے سے شاہ صاحب کو بلا کر قتل کر دیا اور سر کاٹ کر انگریزی کیمپ میں لے گئے اور انعام و اکرام حاصل کیا۔ آپ کی شہادت کا یہ واقعہ 15/جون 1858ء (2/ذی قعدہ 1274ھ) کو پیش آیا۔ مولانا فضلِ حق خیر آبادی نے ''الثورۃ الہندیہ'' (باغی ہندوستان) میں آپ کی شہادت کا ذکر بڑے ہی دردناک انداز میں کیا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندستانی تو کیا انگریز مورخین نے بھی ان کے کارناموں اور خدمات کو بہت سراہا ہے اور ان کے ایثار و قربانی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

عظیم اللہ خاں وہ عظیم شخصیت تھے جس نے تحریکِ آزادی کی آبیاری میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ایک معمولی اور غریب خاندان کے

فرد ہونے کے باوجود وہ غیر معمولی اہلیت وصلاحیت کا فرد تھا۔ اس نے اپنی زندگی ایک معلم یا معمولی ملازم کی حیثیت سے شروع کی، لیکن اپنی قابلیت کے سہارے وہ ترقی کی منازل طے کرتا چلا گیا۔ اس نے انگریزی، فرانسیسی اور فارسی زبانوں میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ اس وقت انگریزی جاننے والے ہی بہت کم تھے، فرانسیسی جاننے والے تو شاذ ہی ہوتے تھے۔ اپنی قابلیت وصلاحیت کی بنا پر وہ نانا صاحب کا منظور نظر اور مشیرِ خاص بن گیا۔ انھوں نے عظیم اللہ خاں کو اپنی پنشن کے سلسلے میں ایک وفد کا قائد بنا کر لندن بھیجا۔ اس نے وہاں بھی اپنی شخصیت وصلاحیت کا بہت گہرا تاثر چھوڑا۔ لندن سے وہ فرانس ہوتا ہوا ترکی پہنچا۔ وہاں جنگ کریمیا میں اس نے انگریزوں کی شکست اور بدحالی کا حال سنا، اس لیے بہ چشمِ خود مشاہدے کے لیے وہاں پہنچا۔ اس وقت ہندستان میں یہ خیال عام تھا کہ انگریز ناقابلِ تسخیر ہیں۔ جنگِ کریمیا کا حال دیکھ کر عظیم اللہ خاں کا یہ بھرم ٹوٹ گیا۔ اس نے ہندستان واپس آکر اور نانا صاحب کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف بغاوت کی منصوبہ سازی کی اور عوام وخواص کے دل و دماغ سے یہ بات دور کرنے کی کوشش کی کہ انگریزوں کو شکست نہیں دی جاسکتی اور انھیں ہندستان سے نکالا نہیں جاسکتا۔ اس نے ہم خیال لوگوں کو بڑے ہی پوشیدہ ڈھنگ سے متحد کیا۔

کانپور، اودھ، روہیل کھنڈ اور وسط ہند میں انگریزوں کے خلاف ہونے والی کارروائیوں میں وہ برابر شریک رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عظیم اللہ خاں کی قابلیت، تدبر، اصابتِ رائے، عزم وعمل اور صلاحیت تنظیم نے اس تحریک کے خط وخال بنانے میں زبردست کردار ادا کیا۔ وہ دراصل غیر معمولی شخصیت کا حامل تھا۔ ساورکر نے بھی اسے 1857ء کی انقلابی جنگ کا نہایت اہم کردار تسلیم کیا ہے۔

متذکرہ بالا دس قائدین کی قیادت وسیادت کے باوجود یہ تحریک کیوں ناکام ہوئی، یہ ایک بڑا سوال ہے؟ اس کے بہت سے اسباب و وجوہ ہیں جن کا تجزیہ ایک بڑے مقالے یا ایک کتاب کا متقاضی ہے۔ بہر حال حالات کی ناسازگاری، اپنوں کی بیگانگی، بے حسی، بے غیرتی، بے حمیتی نے اس تحریک کو سبوتاژ کیا اور قائدین کی قیادت ولیاقت منہ دیکھتی رہی۔ بہ قول میر: ''رکھ تسلی کہ یوں مقدر تھا''۔

......(ص:28 کا بقیہ)......

(16) ایضاً،ص:443
(17) ایضاً،ص:465
(18) ایضاً،ص:467
(19) ایضاً،ص:468
(20) ایضاً،ص:456
(21) ایضاً،ص:458
(22) ایضاً،ص:460
(23) ایضاً،ص:461
(24) ایضاً
(25) ایضاً،ص:419
(26) بحوالہ جنگ آزادی اور وطن کے جاں باز، عبدالمالک مصباحی، ص:48
(27) رسالہ اسباب بغاوت ہند، سر سید احمد خاں، ص:36
(28) اخبار سامری، لکھنؤ، مورخہ 15 ر دسمبر 1856ء، بحوالہ جنگ آزادی اور وطن کے جاں باز، عبدالمالک مصباحی، ص:49
(29) مقدمہ 1857ء کا تاریخی روزنامچہ، از خلیق احمد نظامی، ص:20
(30) باغی ہندوستان، علامہ فضل حق خیر آبادی، ص:31
(31) عربی سے ترجمہ، ایضاً
(32) نور مغربی، جلد:5، شمارہ:13، خبر کلکتہ 28 / مارچ 1857ء، بحوالہ غداروں کے خطوط، ص:31
(33) اسباب بغاوت ہند، سر سید احمد خاں، بحوالہ مراد آباد تاریخ جدو جہد آزادی، محبوب حسین، ص:119
(34) جنگ آزادی اور وطن کے جاں باز، عبدالمالک مصباحی، ص:49
(35) روز نامچہ عبداللطیف مرتبہ خلیق احمد نظامی، ص:115، اس میں عقیدت کا رنگ غالب ہے، لیکن اسے صرف بہادر شاہ ظفر کی نیک نیتی اور مذہبی لگاؤ کو بتانے کے لیے نقل کیا گیا ہے۔
(36) مقدمہ سرگزشت دہلی، از: درخشاں تاجور، ص:11
(37) F.G.C. Hearenshaw, The Ifs of History, P-156-157
(38) پیش لفظ تاریخ جنگ آزادی ہند اٹھارہ سو ستاون، از: وقار الحسن صدیقی، ص:16
(39) سرگزشت دہلی، مرتبہ: درخشاں تاجور، ص:250
(40) غداروں کے خطوط، تالیف وتدوین: سید عاشور کاظمی، ص:37
(41) غداروں کے خطوط، تالیف وتدوین: سید عاشور کاظمی، ص:114
(42) روزنامچہ عبداللطیف مرتبہ خلیق احمد نظامی، ص:162
(43) مضمون سلیم قریشی، غداروں کے خطوط، ص:17
(44) ایضاً
(45) ایضاً،ص:149
(46) ایضاً،ص:141
(47) جاں باز مرزا،ص:122

سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کے جہاد کی حقیقت

شکیل احمد مصباحی

ہندستان پر انگریزوں کے تسلط کے نتیجے میں ہندستانیوں کی جانب سے وقتاً فوقتاً ان کے خلاف بے چینی اور بغاوت کا ماحول پیدا ہوتا رہا، جو 1857ء میں ایک منظم پیمانے پر میرٹھ کی چھاؤنی سے شروع ہوکر ہندستان کے دیگر خطوں میں بھی پہنچ گیا۔ اس سلسلے میں ہندو قوموں کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں اور علماے کرام کی کوششیں بھی مسلسل آزادی کے حصول تک جاری رہیں۔ متعصب تاریخ نگاروں نے جب ان حالات اور ماحول کا نقشہ اپنے طور پر پیش کیا تو حقائق کے ماتھے پر سیاہی پوت کر تعصب اور تنگ نظری سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کے کردار کو بالکلیہ ختم کردینے کا ناپاک جرم کیا۔ اس پہلو کا دوسرا رخ یہ سامنے آیا کہ سوادِ اعظم اہل سنت سے خارج علما جنگ آزادی کا سارا کردار اپنے نام کرنے لگے۔ اور علماے اہل سنت کے مقتدر مجاہدین آزادی کو انگریز نوازوں کی فہرست میں شمار کروانے لگے یا پھر اپنی جماعت کا فرد بنا کر علماے اہل سنت کے عظیم کارناموں کے نشانات پر مٹی ڈالنے کی ننگی جرأت ہی کر بیٹھے۔ اب ان حالات میں ضروری ہے کہ اصل واقعات سے قوم کو روشناس کرایا جائے اور بازارِ سیاست کے دلالوں کے سامنے حقیقی صورت حال پیش کردی جائے تاکہ آج جو غدارِ وطن کا بدنما داغ اقتدار کے زور پر ہماری پیشانیوں پر مڑھا جا رہا ہے، اس کا بے بنیاد ہونا معلوم ہوجائے۔

سید احمد اور شاہ اسماعیل کے تعلق سے پورا دیوبندی مکتبِ فکر مسلسل تحریر وتقریر کے ذریعہ یہ ذہن دینے کی کوشش کرتا رہا ہے کہ انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی اور جہادی سرگرمیوں میں سارا رول ان ہی کا ہے اور انھوں نے ہی مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے وعظ کے ذریعہ منظم کرنے کے بعد جنگیں کیں اور شہادت کے درجے پر فائز ہوئے، جب کہ سچائی اس کے برعکس ہے، بلکہ یہ دونوں اور ان کے دیگر حامی ومتبعین انگریزوں کے وظیفہ خوار اور مکمل ہم نوا تھے۔ اس سلسلے میں خود افرادِ خانہ کی بے شمار شہادتیں موجود ہیں، جن میں سے چند ایک ہدیۂ قارئین ہیں۔

سیاسی مصلحت کی بنا پر سید احمد صاحب نے اعلان کیا کہ سرکار انگریز سے ہمارا مقابلہ نہیں اور نہ ہمیں اس سے کچھ مخاصمت ہے۔ ہم صرف سکھوں سے اپنے بھائیوں کا انتقام لیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ حکام انگلشیہ بالکل باخبر نہ ہوئے اور نہ ان کی تیاری میں مانع آئے۔ (حیات طیبہ، مطبوعہ مکتبۃ الاسلام، ص:260)

اسی مفہوم کی عبارت دوسرے مقام پر یوں ہے:

''سید صاحب کے پاس مجاہدین جمع ہونے لگے، سید صاحب نے مولانا شہید کے مشورے سے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی شمالی کی خدمت میں اطلاع دی کہ ہم لوگ سکھوں سے جہاد کرنے کی تیاری کرتے ہیں، سرکار کو تو اس میں کچھ اعتراض نہیں ہے۔ لیفٹیننٹ گورنر نے صاف لکھ دیا کہ ہماری عمل داری میں امن میں خلل نہ پڑے تو ہمیں آپ سے کچھ سروکار نہیں، نہ ہم ایسی تیاری میں مانع ہیں۔ یہ تمام بین ثبوت صاف اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ جہاد صرف سکھوں سے مخصوص تھا سرکار انگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز مخاصمت نہ تھی۔'' (حیات طیبہ، مکتبۃ الاسلام، ص:523)

اس تعلق سے مولانا جعفر تھانیسری کی تحریر اس طرح ہے:

''سید صاحب کا انگریزی سرکار سے جہاد کرنے کا ہرگز ارادہ نہیں تھا، وہ اس وقت آزاد عمل داری کو اپنی ہی عمل داری سمجھتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سرکار انگریز اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندستان سے سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ ملتی، مگر سرکار انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔'' (حیات سید احمد شہید، ص:293)

سر سید بھی ان واقعات کی طرف عنانِ قلم موڑتے ہوئے بالکل ملتی جلتی باتیں لکھتے ہیں، جس سے سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کے جہادی کارناموں کا سراغ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے:

''سید احمد صاحب نے پشاور پر پھر سکھوں کا قبضہ ہونے کے بعد اپنے ان رفیقوں سے جو جہاد میں جان دینے پر آمادہ تھے، یہ کہا کہ تم جہاد کے لیے بیعت شرع کرلو، چناں چہ کئی سو آدمی

نے اسی وقت بیعت کی اور یہ بات تحقیقی ہے کہ جو شخص شیر سنگھ کے مقابلے میں لڑائی سے بچ رہے تھے ان میں صرف چند آدمی اپنے پیشوا سید احمد صاحب کی شہادت کے بعد مولوی عنایت علی اور ولایت علی ساکن پٹنہ ان کے سردار ہوئے، لیکن انھوں نے جہاد کے فرائض انجام دینے میں کچھ کوشش نہیں کی اور جب پنجاب پر گورنمنٹ انگریز کا تسلط ہوا تو مولوی عنایت علی اور ولایت علی مع اپنے اکثر رفیقوں کے 1847ء میں اپنے گھروں کو واپس بھیج دیے گئے، پس اس سے ہم کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ خاص پٹنہ یا بنگالہ کے اور ضلعوں سے بلکہ عموماً ہندستان سے روپے اور آدمی اس وہابیت کے پہلے تین زمانوں میں ضرور سرحد کو بھیجے گئے تھے۔ لیکن میری رائے میں یہ بات بہت کھلی ہوئی ہے کہ ان میں سے کوئی آدمی انگریز گورنمنٹ پر حملہ کرنے کے واسطے ہرگز نہیں گیا تھا اور نہ ان سے یہ کام لیا گیا اور نہ تین زمانوں میں سے کسی کو اس کا کچھ خیال ہوا کہ ہندستان کے مسلمانوں کی نیت بغاوت کی جانب مائل ہے۔'' (مقالات سرسید حصہ نہم 145-146)

مزید شواہد کے لیے اور آگے کی عبارت بھی ملاحظہ کریں:

''جب مولوی عنایت علی اور ولایت علی 1847ء کو ہندستان لوٹ آئے تو اس وقت سید احمد صاحب کے چند پیرو کار سرحد پر باقی رہ گئے تھے اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ ان دو شخصوں نے پٹنہ اور اس کے قرب و جوار کے آدمیوں کو اس کی ترغیب دینے میں ہرگز کوتاہی نہیں کی کہ وہ جہاد میں شریک ہوں اور یہ اس کام کے واسطے روپیہ جمع کریں۔ چناں چہ وہ برابر بڑی سرگرمی سے کوشش کرتے رہے، اور جس بات کا اب تک ان کو دل سے خیال تھا اس کا اظہار انھوں نے 1851ء میں اس طرح صحیح ہے، کیا کہ وہ پھر ہندستان سے سرحد کی جانب چلے گئے، مگر ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے خیال کیا کہ یہ لوگ دوبارہ سرحد کو انگریزوں پر حملہ کرنے کی نیت سے گئے تھے اور انھوں نے بجائے سکھوں کے انگریزوں پر جہاد کیا تھا۔ حالاں کہ جب ان لوگوں کو انگریزوں سے کسی طرح کی شکایت نہ تھی تو پھر ان کا ارادہ کسی طرح پر صحیح نہیں ہو سکتا۔'' (ایضاً، ص:147)

اس پر تھوڑی اور روشنی ڈالتے ہوئے سرسید کا رواں قلم سرخ لکیر کھینچتا ہوا نظر آتا ہے، جس سے سید احمد رائے بریلوی کا کردار پوری طرح لہولہان نظر آتا ہے:

''اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ وہابی اپنے مذہب میں بڑے پکے، نہایت سچے ہوتے ہیں، وہ اپنے اصول سے کسی حال میں منحرف نہیں ہوتے، اور جن شخصوں کی نسبت میں یہ لکھ رہا ہوں، وہ اپنے بال بچوں اور مال و اسباب کو گورنمنٹ انگریزی کی حفاظت میں چھوڑ گئے تھے اور ان کے مذہب میں اپنے بال بچوں کے محافظوں پر حملہ کرنا نہایت ممنوع ہے، اس لحاظ سے اگر وہ انگریزوں سے لڑتے اور لڑائی میں مارے جاتے تو وہ بہشت کی خوشبوؤں اور شہادت کے درجہ سے محروم ہو جاتے، بلکہ اپنے مذہب میں گناہ گار خیال کیے جاتے۔'' (ایضاً، ص:148)

مذکورہ اقتباسات کی بنیاد پر دیوبندی جماعت کے پیشوا سید احمد رائے بریلوی کو انگریز نوازوں کی پہلی فہرست اور بانیوں میں شمار کرنا تاریخی سچائی ہے اور اس میں کوئی جرم نہیں کہ انھیں انگریزوں کا کھلا ہوا معاون اور ناصر گردانا جائے، جب کہ ان شکستہ حالات، فریاد کناں ماحول میں علماے اہلِ سنت اپنے وطن کی آزادی کے لیے پوری طرح انگریزی افواج کے خلاف صف آرا اور تحریر و تقریر کے ذریعہ عام ہندستانیوں کو انگریزوں کے خلاف متحد کر رہے تھے، جس کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتوں کے ساتھ جان و مال کے اتلاف کا شکار بنتے رہے۔

انگریز نوازی کے ایسے واقعات سے خود سید احمد کے ماننے والوں ہی کی کتابیں شورِ محشر جیسا ماحول پیش کرتی ہیں اور بعد کے متبعین کی جھوٹی کہانی کا کھلا مذاق اڑاتی ہیں۔ سوانح احمدی، مخزن احمدی، نقش حیات، الدرر المنثور وغیرہ کی عبارتیں بھی سید صاحب کے جہاد کو انگریز مخالف برسرِ پیکار طاقتوں کے خلاف بتاتی ہیں، مگر اس جماعت کے شرپسندوں نے تاریخ نگاری کی روایت پر فرنگی ظلم کرتے ہوئے تاریخ سازی کی نئی طرح ایجاد کر کے یہ بتا دیا کہ جھوٹی شہیدی کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اب جھوٹی تاریخ کا سبق بھی عام کریں گے۔ حالاں کہ سید احمد کے عہد کے قریبی مورخین وہی باتیں لکھتے رہے جو علماے اہلِ سنت بتاتے رہے ہیں۔ مگر بعد کے مورخین نے اپنی جماعت کے اکابرین کا دامن الجھتا دیکھ کر دروغ گوئی سے تاریخ کے صفحات پاٹ دیے۔

سید احمد کے جہادی پہلو کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اقتباس بھی کافی واضح ہے:

''سرکار انگریز گو منکرِ اسلام ہے، مگر مسلمانوں پر کوئی ظلم اور تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرائض مذہبی اور عبادات لازمی سے روکتی ہے، ہم ان کے ملک میں اعلانیہ کہتے ہیں اور ترویج مذہب کرتے ہیں، وہ کبھی مانع و مزاحم نہیں ہوتی، بلکہ اگر ہم پر کوئی ظلم و زیادتی کرتا ہے تو اس کو سزا دینے کو تیار ہے، پھر ہم سرکار انگریز پر کس سبب سے جہاد کریں اور اصولِ مذہب کے خلاف بلا وجہ طرفین کا خوف گرا دیں۔'' (حیات سید احمد شہید، ص:171)

فرانس کے مشہور مستشرق گارسن دتاسی کی کتاب تاریخ ادب اردو کی تلخیص طبقات الشعراے ہند، ص:295 مطبوعہ 1848ء میں سید صاحب کے تعلق سے موجود ہے کہ:

''بیس برس کا عرصہ ہوا کہ وہ سکھوں کے خلاف جہاد کرتا ہوا مارا گیا۔''

یہی بات دوسرے لفظوں میں نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے ترجمانِ وہابیہ میں بھی لکھی ہے کہ:

''حضرت شہید کا جہاد انگریزوں کے خلاف نہ تھا۔'' (ترجمانِ وہابیہ، ص:21-88)

یہی حال شاہ اسماعیل کا بھی تاریخ کے صفحات پر نظر آتا ہے۔ خود وہابی نظریات کے حامل قلم کاروں اور ان کے عہد کے قریبی تذکرہ نگاروں نے ان کی انگریزوں سے قربت اور وفاداری کے لڈو ہر خاص و عام کو بانٹے ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ 1857ء کے وقت وہابی، دیوبندی جماعت کا وجود ہی نہیں تھا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اکابر دیوبند نے جنگ آزادی میں اہم رول ادا کیا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا بگل بجایا، شدید ترین ناانصافی اور زیادتی ہے۔ اس کے برعکس علامہ فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا کفایت علی کافی مراد آبادی، مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا وہاج الدین مراد آبادی، مولانا لیاقت علی الٰہ آبادی اور دوسرے علماے کرام نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا اور عام مسلمانانِ ہند کو بیدار کیا۔ مگر علماے سوء کا یہ طبقہ پوری چاپلوسی کے ساتھ انگریزی حمایت میں قولاً و عملاً سرگرم رہا، جس کی گواہی خود افرادِ خانہ نے ہی دے دی ہے۔ کلکتہ کے جلسۂ عام میں جب ایک شخص نے شاہ اسماعیل سے پوچھا کہ انگریزوں کے خلاف آپ جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے تو شاہ صاحب نے فرمایا:

''ان پر جہاد کرنا کسی طرح واجب نہیں، ایک تو ان کی رعیت ہیں، دوسرے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست درازی نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے، بلکہ ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔'' (حیات طیبہ، طبع قدیم، ص:364)

مرزا حیرت دہلوی کی یہ بھی تحریر ملاحظہ ہو:

''مولوی اسماعیل صاحب نے اعلان کر رکھا تھا کہ انگریزی سرکار پر نہ جہاد مذہبی طور پر واجب ہے نہ ہمیں اس سے کچھ مخاصمت ہے۔'' (حیات طیبہ، ص:201)

اس تعلق سے سرسید نے بھی انتہائی واضح الفاظ استعمال کر کے انگریز نوازی کی ساری پول کھول دی:

''اس زمانے میں مجاہدین کے پیشوا سید احمد صاحب تھے، مگر وہ واعظ نہ تھے۔ واعظ مولوی محمد اسماعیل صاحب تھے، جن کی نصیحتوں سے مسلمانوں کے دلوں میں ایک ایسا ولولہ خیز اثر پیدا ہوتا تھا جیسا کہ کسی بزرگ کی کرامت کا اثر ہوتا ہے۔ مگر اس واعظ نے اپنے زمانہ میں کبھی کوئی لفظ اپنی زبان سے ایسا نہ نکالا جس سے ان کے ہم مشربوں کی طبیعت ذرا بھی برافروختہ ہو، بلکہ ایک مرتبہ کلکتہ میں سکھوں پر جہاد کرنے کا وعظ فرما رہے تھے۔ اثناے وعظ میں کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کرنے کا وعظ کیوں نہیں کہتے، وہ بھی تو کافر ہیں؟ اس کے جواب میں مولوی اسماعیل دہلوی صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی اور چوں کہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں اس لیے ہم پر اپنے مذہب کی رو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ ہوں۔'' (مقالات سرسید، حصہ نہم، ص:42-141)

یہ تمام شواہد سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کو انگریزوں کا ایجنٹ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں، مگر جماعت دیابنہ کو یہ سچائی کسی طور پر ہضم ہوتی نظر نہیں آتی اور وہ اپنے اس جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے علماے اہل سنت کی پاک باز، محبّ وطن اور انگریز دشمن شخصیات کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں تا کہ ان کا مکروہ کردار عام لوگوں کے سامنے نہ آسکے۔

جہادِ آزادی اور مشرکین کی انگریز نوازی

غلام مصطفیٰ رضوی

انگریز تاجر کی حیثیت سے ہندستان آئے، سازشوں کے تانے بانے بنے اور سفید و سیاہ کے مالک بن بیٹھے۔ سلطنتِ مغلیہ کا آخری چراغ ٹمٹمایا اور پھر بجھ گیا، یوں اقتدار انگریزوں کے ہاتھ آ گیا۔ اہلِ حق کب تک نصاریٰ کی حاکمیت تسلیم کرتے لہٰذا علماے کرام نے جہاد کا فتویٰ صادر فرمایا جس کے محرک امام الحکمت علامہ فضل حق خیر آبادی تھے، جن کی صداے دل نواز نے مسلمانوں میں جوش و ولولہ پیدا کر دیا اور جہاد کی روح پھونک دی۔ علماے حق نے فتواے جہاد پر اپنے دستخط ثبت فرمائے، علماے سوء انگریزوں کے ہم نوا ہوئے۔

دہلی سے شاہ جہاں پور، لکھنؤ اور روہیل کھنڈ و آگرہ تک جنگ آزادی لڑی گئی، جسے انقلاب 1857ء کے نام سے شہرت حاصل ہے۔ یہ جنگ آزادی بظاہر ناکام ہوئی لیکن اس کے اثرات گہرے ہوئے اور بعد میں ایک وقت ایسا آیا کہ ہند سے واپسی میں ہی انگریزوں نے عافیت جانی۔ مسلمانوں کے عزمِ محکم کا انھیں اندازہ ہو چلا تھا۔ علماے حق کو چن چن کر شہید کیا گیا۔ انڈمان میں قید و بند میں مبتلا کیا گیا۔ جزائرِ ہند کی ناموافق شوریدہ فضاؤں میں اسیر بنایا گیا، ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے، لیکن ان علماے حق کے قدم نہ ڈگمگائے، نہ عزائم شکست کھائے۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مشہور مقولہ ہے: ''تاریخ اقتدار کے سائے میں لکھی جاتی ہے۔'' اور وہی ہوا۔ ہند سے انگریز رخصت ہوئے۔ ریاست و امارت مشرکین کے حوالے کر گئے۔ ہونا تو یہ تھا کہ جن سے حکومت چھینی انھیں لوٹا جاتے، لیکن ع: کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

جو تاریخ مرتب کی گئی اس میں صداقت کا عنصر بھی شاید و باید۔ مسلمانوں کے تذکرے بھی کیے گئے تو خال خال۔ جو نصاریٰ کے معین و حامی تھے انھیں آزادی کا مجاہد قرار دے دیا گیا، جاں نثاروں کے تذکرے کھرچ ڈالے گئے۔ تاریخ نویسی نہیں تاریخ گری کی گئی، جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کیا گیا۔ لیکن صداقت آشکار ہو کر رہتی ہے، تاریخ کے چہرے سے غبار چھٹتے جاتے ہیں، روشنی ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ تاریخ کا یہ عمل بتدریج واقع ہوتا ہے۔ وہ جنھوں نے مصائب و آلام جھیلے، اپنے خون کی روشنائی سے تاریخِ ہند کے سنہرے باب رقم کیے، دو؛؛ محاذوں پر سرگرم عمل رہے۔ نصاریٰ کے تسلط سے ملک کی آزادی کی بنا رہی اور مشرکین کے دامِ فریب کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ ان کی حیات تابندہ کا ایک ایک گوشہ یقیناً اجاگر ہوگا اور ہم اپنے سلف کے کارہاے نمایاں سے مستقبل کی تعمیر کر سکیں گے۔

1857ء کی جنگ آزادی جسے ''غدر'' کا نام دیا گیا، اس کی اصل تاریخ چھپائے رکھنے کی کوشش کی گئی۔ کچھ تو اسباب و علل ہوں گے، شاید یہی کہ ایک جھوٹی تاریخ وضع کرنی تھی، اقتدار کی منتقلی مشرکین کی سمت ہونی تھی، مسلم نسل کو ان کے اسلاف کے کارناموں سے بے خبر رکھنا تھا، اسی لیے داستانِ حق رقم کی اشاعت کرنا جرم و عار سمجھا گیا۔ 1857ء کی داستان ''الثورۃ الہندیہ'' (از علامہ فضل حق خیر آبادی، متوفی 1278ھ) جس کا حرف حرف صداقت کا آئینہ، مسلمانوں کی شجاعت کا آبگینہ تھا، اس کی طباعت کے اسباب نہ ہو سکے۔ ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

''غدر 57ء کی بربادیوں کے بعد لوگوں کی ہمتیں اس درجہ پست ہو گئی تھیں کہ اس قسم کی تحریرات کی اشاعت کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ خود مولانا (فضل حق خیر آبادی) کے خاندان نے اس کی اشاعت مصلحت کے خلاف سمجھی اور جن لوگوں کے پاس اس کی نقلیں تھیں وہ بھی اس کی نمائش احتیاط کے

خلاف سمجھتے تھے۔ آج ہم اس رسالہ ''الثورۃ الہندیہ'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں پاتے جسے سیاسی حیثیت سے خطرناک تصور کیا جائے، لیکن اس زمانے کا حال دوسرا تھا۔''

(تعارف الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) طبع مبارک پور، ص:32)

مشرکین کی چیرہ دستیاں بھی تاریخِ ہند کے باب میں ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہیں۔ اسے چھپائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اس میں وہ بھی شامل تھے جو مشرکین سے اتحاد و داد بنائے بیٹھے تھے۔ اس تعلق سے تاریخی تناظر میں شاہ احمد رضا خاں محدث بریلوی (متوفی 1921ء) کی تصنیف المحجۃ المؤتمنۃ فی آیۃ الممتحنۃ (ترکِ موالات) طبع از ممبئی کا مطالعہ کافی مفید ہوگا، جس میں مسلمانوں کو شرکیہ رنگ میں رنگنے کی سازشوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ تاریخ کے ان گوشوں سے بھی باخبر رہنے کی ضرورت ہے کہ ہنود نے کہاں کہاں انگریزوں سے ساز باز کر کے مسلمانوں کو حکومت و امارت اور وجاہت و شوکت سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ عمل 1857ء کی تحریک سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا جس پر الثورۃ الہندیہ میں واضح اشارے ملتے ہیں۔ گرچہ انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو لڑانے کے لیے گائے اور سور کی چربی کی آمیزش والے کارتوس رائج کیے تاہم اصل نشانہ اسلامی شعار ہی تھے اور مسلمان بھی۔

1857ء کی جنگ میں علما نے قائدانہ کردار ادا کیا، جن میں بعض نمایاں و ممتاز شخصیات کے اسما ملاحظہ کریں: مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا کفایت علی کافی مراد آبادی، مولانا وہاج الدین مراد آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا رضا علی بریلوی، مولانا امام بخش صہبائی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رام پوری، مولانا لیاقت الٰہ آبادی، مفتی مظہر کریم دریابادی، سید اسماعیل منیر شکوہ آبادی وغیر نیز بہادر شاہ ظفر، جنرل بخت خاں روہیلہ، خان بہادر خاں روہیلہ، شہزادہ فیروز شاہ، عظیم اللہ خاں نواب باندہ، نواب اکبر خاں بن نواب فیض اللہ خاں بنگش، نواب عبدالرحمٰن خاں والی جھجھر وغیرہ۔

(اداریہ ماہنامہ کنز الایمان دہلی، جون 2007ء، ص:3)

ان کے مقابل مشرکین نے نصارا کی ہر ممکن مدد کی۔ بعض کلمہ گو کہلانے والے بھی انگریزوں کے اعوان و انصار بنے رہے۔ مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی نے الثورۃ الہندیہ میں جگہ جگہ مشرکین کی انگریز دوستی کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح جہادِ آزادی کو سبوتاژ کرنے میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ایسی ہی چند جھلکیاں ملاحظہ کریں:

علامہ فضل حق خیر آبادی لکھتے ہیں:

''نصاریٰ (انگریز) جب لڑتے لڑتے تھک گئے اور پست ہو گئے تو غربی ہندوؤں سے مدد و معاونت کے طالب ہوئے۔ ہندوؤں نے کثیر لشکر اور ساز و سامان حرب سے تھوڑی سی مدت میں پے در پے مدد کی تب نصاریٰ نے سخت لڑائی ٹھان دی اور اس پہاڑی پر بہت سا لشکر اور مددگار و معاون جمع کر لیے۔ ان کے لشکریوں میں گورے منہ کے گروہ بھی تھے اور ذلیل ترین ہندو اجیر بھی۔'' (تعارف الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) طبع مبارک پور، ص:39)

''ہر عیسائی دوست ہندوان کی مدد میں پیش پیش تھا۔''

(نفس مصدر، ص:43)

''ہندوؤں میں سے صرف وہ مارے گئے جن کے متعلق دشمن و معاند ہونے کا یقین تھا اور مسلمانوں میں سے فقط وہ بچ سکے جو کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہجرت کر گئے تھے، یا وہ جو نصاریٰ کے ناصر اور اپنے دین و مذہب میں قاصر تھے۔'' (نفس مصدر، ص:51)

''ادھر نصاریٰ نے ماتحت ہندو روٴسا کے پاس پیغام بھیجا کہ جو شخص بھی تمھارے علاقے میں سے گزرے اسے پکڑ لیا جائے۔ ان بد اطواروں نے کافی تعداد میں مسافروں اور مہاجروں کو پکڑ کر نصرانی سرداروں کے پاس پہنچا دیا۔'' (نفس مصدر، ص:51)

ایک معرکہ میں مشرکین کی بدعہدی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس پر ستم یہ ہوا کہ کفار اور دیہاتیوں نے معاہدہ و قسم کے باوجود وقت پر دغا کی۔ غدر و مکر کی انتہا کر دی۔ ناز و نعمت اور پر عیش و مسرت زندگی کا کفران کیا۔ معاہدوں سے...... (باقی ص:45 پر)......

برطانوی عہد میں
اسلام اور عیسائیت کے درمیان مناظرے

محمد قطب الدین رضا مصباحی

ہندستانیوں کی بدقسمتی سے انگریزوں نے اس ملک کے سیاہ و سفید پر قبضہ جمالیا۔ سیاسی سطح پر کامیابی کے بعد مذہبی سطح پر تبلیغ شروع کر دی۔ انگلستان سے بڑے بڑے پادری انڈیا آئے اور عیسائی مشنری کا تبلیغی کام شروع ہوا۔ بڑے زور و شور کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ میں منہمک ہوئے۔ اس کے لیے ان کی ایک پوری تحریک تھی جو بڑی تیزی کے ساتھ عیسائیت کے فروغ میں سرگرم تھی۔ ان کا اصل نشانہ اسلام تھا۔ مسلمانوں کے پاس پہنچ کر اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرتے۔ اسلام کے بنیادی عقائد کو تنقید کا نشانہ بناتے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کافی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا، وسیع پیمانے پر کام کیے۔ اپنے مذہب کو فروغ دینے کی خاطر کتابیں تصنیف کیں۔ فردی طور پر بھی لوگوں تک پہنچ کر اپنے نظریات بیان کرتے اور اپنے پیغامات عام کرنے کے لیے دینی اجتماعات، جلسے جلوس بھی منعقد کراتے۔ گویا تبلیغِ عیسائیت کی ایک لہر چل پڑی تھی۔ ہر طرف ماحول گرم ہو چکا تھا۔ مذہبی حلقوں میں اس تحریک سے خوف و ہراس کا ماحول پیدا ہو گیا۔ حالات سے مجبور علما کی خاموشی سے پادریوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور کھلے عام اسلام کے خلاف باتیں بکنا شروع کر دیا تھا۔

یقیناً وہ قیامت خیز ماحول تھا۔ مسلمان ایک طرف سیاسی سطح پر فرنگیوں کے ظلم و ستم سے پریشان تھے اور دوسری طرف مذہبی دل آزاری نے ان کا چین و سکون غارت کر رکھا تھا۔ علماے کرام کی ایک ٹولی ملک سے ان کا پنجۂ استبداد ختم کرنے میں کوشاں تھی۔ بے سروسامانی کے باوجود وہ ان سے مقابلہ کے لیے سینہ سپر تھے، اور علما کا دوسرا گروہ دین میں ان کی شرپسندیوں کے جواب میں مصروف تھا۔ ان میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا فیض احمد بدایونی اور مولانا آل حسن سرِ فہرست ہیں۔

کچھ حضرات نے اپنی ساری کوششیں ردِ عیسائیت میں صرف کر دیں۔ ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے رد عیسائیت پر کتابیں تحریر کیں، ان کے الزامات کا جواب دیا۔ ان کے عقائد کا جائزہ لے کر ان کی قلعی کھول دی۔ لوگوں کے سامنے حقائق پیش کیے اور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ آخری رسومات کے لیے مجمعِ عام میں پادری سے مناظرے بھی ہوئے۔

نہایت افسوس کی بات ہے کہ ان قیمتی مناظروں کی طرف توجہ نہ دی گئی، اس وقت جو مناظرے ہوئے اور ان کی رودادیں چھپیں، اسی پر اکتفا کیا گیا۔ دوبارہ ان کی اشاعت اور مناظروں کی تفصیل جمع کرنے سے بے توجہی برتی گئی۔ بہت مشکل سے چند ہی مناظروں کی تفصیل مل سکی ہے۔ آئندہ ہماری کوشش جاری رہے گی۔

مناظروں پر ایک اجمالی نظر:

(1) پادری فنڈر سے مولانا آل حسن کا تحریری مناظرہ ہوا جو 22/جولائی 1844ء سے 2/فروری 1845ء تک جاری رہا۔

(2) مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر کے درمیان ایک بڑے مجمع میں 10/اپریل 1845ء کو آگرہ میں ایک تاریخی مناظرہ ہوا۔ اس مناظرے میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے معاون ڈاکٹر وزیر احمد خاں اور مولانا فیض احمد بدایونی تھے۔ عیسائیوں کو شکست دینے میں ان معاونین کا بھی خصوصی کردار رہا۔

(3) مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے شکست کھانے کے بعد پادری فنڈر نے اپنی خفت مٹانے کے لیے ڈاکٹر وزیر خان سے تحریری مناظرہ شروع کیا جو 15/مئی 1854ء سے 17/اگست 1854ء تک جاری رہا۔

(4) مولانا شرف الحق نے عیسائی علما سے کئی مناظرے کیے۔ دسمبر 1891ء میں پادری گولڈ اسمتھ سے حیدر آباد، 8/فروری 1893ء میں پادری جے سمول سے پونہ اور 8/مارچ 1894ء میں پادری رونلس سے غازی پور میں یادگار مناظرے ہوئے۔ یکم اپریل 1891ء میں لارڈ بشپ جے اے سے دہلی کی جامع مسجد فتح پوری میں تحریف انجیل پر ایسے ٹھوس دلائل و شواہد پیش کیے کہ پادری لیفرائے کو اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ مناظرہ ہی میں اس نے اپنا اعتراف تحریری شکل میں پیش کیا۔

ان کے علاوہ بھی اسلام اور عیسائیت کے درمیان کافی مناظرے ہوئے۔ تمام مناظروں میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا مناظرہ کافی مشہور ہوا۔ انھیں دنوں دور دور تک اس کی شہرت پھیل گئی۔ یہ مناظرہ 10/اپریل 1854ء سے تین دنوں کے لیے آگرہ میں منعقد ہوا۔ مناظرے کے لیے پانچ موضوعات کا انتخاب ہوا تھا۔ (1) بائبل میں کچھ احکام منسوخ ہیں (2) بائبل عہد قدیم و جدید میں تحریف واقع ہے (3) عقیدۂ تثلیث (4) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت (5) قرآن کی صداقت و حجیت۔

مناظرے کا پہلا دن:

پہلے دن نسخ کے موضوع پر بحث شروع ہوئی طے شدہ امور کے مطابق مولانا کیرانوی نے بحث کا آغاز کیا۔ پہلے نسخ کی حقیقت کی وضاحت کی اور اس کے مفہوم و معنی کی توضیح فرمائی پھر یہ دعویٰ پیش کیا کہ انجیل کے بعض احکام منسوخ ہیں اور بعض نہیں اور اس پر دو مثالیں بھی بیان کیں کہ انجیل میں طلاق کی ممانعت کا حکم منسوخ ہے، جب کہ انجیل مرقس باب 12 میں توحید کا حکم منسوخ نہیں۔

فنڈر نے کہا کہ انجیل کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہو سکتا اور دلیل کے طور پر انجیل لوقا باب 21 آیت 33 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد پیش کیا:

''زمین و آسمان ٹل جائیں گے مگر میری بات ہرگز نہ ٹلے گی۔''

مولانا کیرانوی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد ہر بات کے لیے نہیں بلکہ صرف اس باب یعنی اکیسویں کے لیے تھا۔

فنڈر نے اس پر اعتراض کیا کہ اس کے الفاظ تو عام ہیں۔

مولانا کیرانوی نے دوسرے حوالوں کی روشنی میں یہ بتایا کہ عیسائی علما کا خود یہ اعتراف ہے کہ ''میری باتیں'' سے مراد اس باب میں ذکر کردہ باتیں ہیں۔

فنڈر سے اس کا جواب نہ بن پڑا تو انجیل کی صحت پر دوسری دلیل لاتے ہوئے پطرس کی یہ عبارت پیش کی:

''کیوں کہ تم فانی تخم سے نہیں بلکہ غیر فانی سے خدا کے کلام کے وسیلے سے جو زندہ اور قائم ہے۔''

اس کی روشنی میں اس نے یہ دعویٰ کیا کہ کلام کے زندہ اور قائم ہونے کا مطلب یہی ہے کہ خدا کا کلام ہمیشہ رہے گا، منسوخ نہیں ہو سکتا۔

مولانا کیرانوی نے اس کے جواب میں توریت کی کتاب یسعیاہ کی یہ عبارت پیش کی:

''گھاس مرجھاتی ہے، پھول کمھلاتا ہے، پر ہمارے خدا کا کلام ابد تک قائم ہے۔''

اور فرمایا کہ اگر وہاں کلام کے زندہ اور قائم ہونے سے منسوخ نہ ہونا مراد ہے تو توریت کے بارے میں یہاں بھی یہی نظریہ رکھنا چاہیے جب کہ آپ خود اس کے سیکڑوں احکام منسوخ قرار دیتے ہیں۔

فنڈر کے لیے جب کوئی راہ نہ رہ گئی تو بات بناتے ہوئے اس نے یوں کہا کہ اس وقت گفتگو صرف انجیل کے نسخ سے ہو رہی ہے، توریت سے نہیں۔

کچھ دیر کی بحث کے بعد مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلام سے مزید کچھ مثالیں پیش کیں جن سے نسخ کا ثبوت فراہم ہوتا تھا۔ جس کے سبب فنڈر کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ انجیل کے احکام کا منسوخ ہونا ممکن ہے۔ لیکن اس نے انجیل میں اس کے وقوع کو تسلیم نہ کیا۔

مولانا کیرانوی نے اس موضوع پر بحث ختم کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت امکانِ نسخ کا اعتراف ہی کافی ہے۔ اس کے وقوع کا اثبات سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی بحث میں ہو جائے گا۔

اتنے پر نسخ کے موضوع پر بحث ختم ہو گئی اور دوسرے موضوع ''تحریف'' پر شروع ہوئی۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے فنڈر سے سب سے پہلے یہ پوچھا کہ کس طرح کی تحریف کے شواہد پیش کیے جائیں جو آپ تسلیم کر لیں۔ فنڈر کی طرف سے اس کا واضح جواب نہ ملنے پر آپ نے یہ سوال کیا کہ بائبل کی کتابوں کے بارے میں آپ کا اعتقاد کیا ہے؟ آیا پیدائش سے لے کر مکاشفہ تک ساری کتابوں کا ہر فقرہ اور ہر لفظ الہامی اور خدا کا کلام ہے یا نہیں؟

فنڈر نے کہا، نہیں۔ ہر لفظ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، بعض مقامات پر کتابت کی بھی غلطی ہے۔

مولانا کیرانوی نے کہا کہ کاتب کی غلطیوں سے اعراض کرتے

مقام و پوسٹ بدر بنہ، ضلع در بھنگہ، بہار

ہوئے دوسرے جملوں اور الفاظ کے بارے میں میرا سوال ہے۔

اس پر فنڈر نے ایک ایک لفظ کے بارے میں کچھ کہنے سے انکار کر دیا تو مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے مورخ یوسی بیئس کے حوالے سے بتایا کہ جسٹس شہید نے بعض بشارتیں نقل کر کے یہ دعویٰ کیا تھا کہ بائبل کے عہد نامہ قدیم سے یہودیوں نے ان بشارتوں کو خارج کر دیا ہے۔ مولانا کیرانوی نے اپنی اس بات کی مزید پختگی کے لیے واٹسن اور تفسیر ہورن بھی دکھائے۔ اس کی روشنی میں مولانا کیرانوی نے فنڈر سے جواب طلب کیا کہ جسٹس نے جو بشارتیں ذکر کیں اور یہودیوں پر ان کے مٹانے کا الزام لگایا وہ اس میں سچا ہے یا جھوٹا؟ اگر سچا ہو تو اس سے ہمارا دعویٰ تحریف ثابت ہو گیا اور اگر جھوٹا ہو تو آپ کا اتنا بڑا عالم اپنی طرف سے باتیں گڑھ کر خدا کا کلام ثابت کرنے کے درپے ہے۔

بات نہ بن سکی تو فنڈر نے کہا کہ جسٹس ایک انسان تھا اس سے بھول ہو گئی۔

پھر مولانا کیرانوی نے ہنری، واسکاٹ کے حوالے سے ثابت فرمایا کہ آگسٹائن نے یہودیوں پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ انھوں نے اکابر کی عمروں میں تحریک کی ہے اور عبرانی نسخوں کو بدل دیا ہے اور آگسٹائن کے اس نظریے سے دوسرے متقدمین کو بھی اتفاق تھا۔

فنڈر نے اس کا جواب دیا کہ ہنری اور واسکاٹ کے لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا ان کے علاوہ سیکڑوں لوگوں نے تفسیریں لکھی ہیں۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے فرمایا: یہ ان دونوں کی اپنی رائے نہیں بلکہ جمہور کے متفقہ مذہب کا بیان ہے۔

فنڈر نے بائبل کی حقانیت پر دلیل لاتے ہوئے انجیل یوحنا میں مذکور حضرت یسوع مسیح کا ارشاد پیش کیا اور کہا کہ اس سے بڑھ کر کس کی شہادت ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر خاں نے بڑے لطیف پیرائے میں اس کا رد کر دیا کہ ابھی تو بائبل کی اصلیت ثابت ہی نہیں تو اس کی عبارت سے استدلال کیوں کر ہو سکتا ہے؟

اس پر فنڈر نے کہا کہ ہم نے توریت کی حقانیت پر انجیل سے استدلال کیا، انجیل کو اگر آپ نہیں مانتے تو اس کی تحریف ثابت کریں۔

اس کے بعد ڈاکٹر وزیر خاں نے انجیل متی پڑھنا شروع کیا اور کئی غلطیاں دکھا ڈالیں۔

فنڈر نے یہ کہہ کر اپنی راہ نکالنی چاہی کہ غلطی اور تحریف میں فرق ہے۔ تحریف کا ثبوت اسی وقت ہو گا جب کوئی ایسی عبارت دکھائی جائے جو پرانے نسخوں میں نہ پائی جائے اور موجود نسخوں میں وہ موجود ہو۔

ڈاکٹر وزیر خاں نے جواب دیا کہ الہامی کتاب میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس میں جب غلطیاں موجود ہیں تو یقیناً وہ تحریف کے بعد آئی ہوں گی۔ پھر مزید ڈاکٹر وزیر خاں نے یوحنا سے تحریف ہونے کا ثبوت پیش کیا جس کے نتیجے میں فنڈر نے اعتراف کیا کہ اس جگہ تحریف ہے اور یوں ہی ایک دو جگہوں پر بھی۔

مناظرے کا دوسرا دن:

پہلے دن کے مناظرے کی خبر دور دور تک پہنچ چکی تھی، جسے سن کر لوگ اس منظر کے مشاہدے کے لیے دوسرے دن کا شدت سے انتظار کرنے لگے، ہر کسی کے دل میں ایک شوقِ فراواں پایا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ دوسرے دن ہر مذہب کے لوگ، ہندو، مسلم، سکھ، اور عیسائی کافی تعداد میں جمع ہو گئے۔

مناظرے کا آغاز فنڈر نے اپنی تقریر سے کیا، جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک انجیل اپنی شکل میں محفوظ تھی اور قرآن کریم نے اس پر ایمان لانے کا بھی حکم دیا ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں نے سنجیدہ لب و لہجے میں ٹھوس دلائل سے ان کی باتوں کو رد کر دیا اور یہ واضح فرمایا کہ جس قرآن میں اس پر ایمان لانے کا بیان ہے اسی قرآن میں اس کی تحریف و تبدیل کا بھی ذکر موجود ہے اور مزید شواہد کی روشنی میں بائبل کی تحریف کو ثابت فرمایا۔ ان ساری باتوں کا جواب فنڈر کے پاس یہی تھا کہ ساری غلطیاں کاتب کے سہو کا نتیجہ ہیں۔ ''متن'' کی صحت پر اس کا کچھ اثر نہیں، وہ بالکل محفوظ ہے اور کسی طرح کی غلطی کی اس میں راہ نہیں۔

اس پر حاضرین نے فنڈر سے وضاحت طلب کی کہ ''متن'' سے ان کی مراد کیا ہے۔ فنڈر نے اس کا جواب یہ دیا کہ جن عبارتوں میں تثلیث، الوہیتِ مسیح، کفارہ اور شفاعت کا بیان ہے وہ متن ہے۔

مولانا کیرانوی نے فنڈر کی گرفت کرتے ہوئے کہا کہ جب اتنے سارے مقامات پر تحریف کا اعتراف کر چکے تو متن کی سلامت پر کیا دلیل رہی؟

فنڈر نے کہا کہ خاص متن کی تحریف پر کوئی دلیل نہیں، اس کی تحریف اسی وقت ثابت ہو گی جب اس کا پرانا کوئی ایسا نسخہ دکھائیں جس میں ان سب باتوں کا ذکر نہ ہو اور نئے نسخوں میں موجود ہو۔

مولانا کیرانوی نے دوٹوک اس کا جواب دیا کہ جب بعض مقامات کی تحریف آپ نے تسلیم کر لی تو اس سے کتاب کی ساری عبارتیں شک کے دائرے میں آ گئیں۔ اب کسی خاص عبارت کو الہامی ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہو گی۔

فرنچ نے کہا کہ بائبل کے جن مفسرین کی تحریروں سے تحریف ثابت کی گئی انھیں مفسرین نے تثلیث اور دوسرے عقائد کو درست قرار دیا ہے اور انھیں تحریف سے محفوظ مانا ہے۔

اس پر مولانا کیرانوی نے فنڈر سے اس بات کا اعتراف کرا لینے کے بعد کہ اس نے ابھی تفسیر کشاف اور بیضاوی کی عبارتیں حوالے میں پیش کی تھیں، یہ دریافت کیا کہ انھیں کتابوں میں انجیل کا محرف ہونا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا رسولِ خدا ہونا اور حضور کے منکر کا کافر ہونا مذکور ہے، تو کیا یہ باتیں بھی اسے تسلیم ہیں؟

فنڈر نے ان باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو مولانا کیرانوی نے فرمایا: اسی طرح ہم بھی بائبل کے مفسرین کی یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ بعض مقامات پر کھلی تحریف کے ہوتے ہوئے عقیدۂ تثلیث وغیرہ بالکل سلامت ہو۔ تحریف کے اثبات میں ان مفسرین کے اقوال کا نقل محض الزامی طور پر تھا۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ ان کی ہر بات ہمیں تسلیم ہے۔

فنڈر مولانا کیرانوی کی ان باتوں میں الجھ کر رہ گیا اور اسے مفر کی کوئی راہ نہ ملی تو آخر میں یہ کہا کہ بہر حال یہ عقیدۂ تثلیث تحریف سے محفوظ ہے۔ جب تک اس کی تحریف ثابت نہ ہو، آگے بحث نہیں کی جائے گی۔

دو دنوں کے طویل بحث و مباحثہ اور بالکل واضح اور نمایاں دلائل سے بائبل کی تحریف ثابت کر دینے کے بعد بھی فنڈر نے بائبل کے محرف اور ناقابل احتجاج ہونے کو تسلیم نہ کیا اور آخر تک اپنی ضد اور اصرار پر قائم رہا۔

مناظرے کے لیے تین دنوں کے وقت کی تعیین ہوئی تھی۔ اسی لحاظ سے پانچ موضوعات منتخب ہوئے تھے۔ مگر دو دنوں ہی کے بحث و مباحثہ سے فنڈر اتنا ہراساں ہوا کہ تیسرے دن مناظرے کے لیے آیا ہی نہیں۔ پھر بھی دو دنوں تک مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی واضح برتری کی بنیاد پر حاضرین کو حقانیت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ فنڈر کی اس شکست سے اس کی بڑھتی ہوئی تحریک پر کچھ دنوں کے لیے گہرا اثر پڑا۔

......(ص:41 کا بقیہ)......

انکار کر کے کفر میں اضافہ اور ارتداد میں زیادتی کر لی۔ اس موقع پر مسلط نصاریٰ سے قتال کے لیے دوسری طرف کا ایک عالم (مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی) اٹھ کھڑا ہوا۔'' (نفس مصدر، ص:67)

مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی نے انگریزوں کو شکست دے دی۔ انگریزوں نے فرار کی راہ اختیار کی اور انھیں ہنود نے پناہ مہیا کی۔ اس سے متعلق فرماتے ہیں:

''اپنی ساری کوششیں ختم کر کے وہ بھاگے اور قصبہ کے ایک ہندو کے مضبوط و محفوظ مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔'' (نفس مصدر، ص:69)

مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی جو بڑے بہادر و جری تھے، انگریزوں سے لرزہ بر اندام تھے، ان کی شہادت کے لیے بھی ہندوؤں نے انگریزوں کی مدد کی۔ اس کا ذکر علامہ فضل حق خیر آبادی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ادھر اس نیک سرشت بہادر عالم سے ایک دیہاتی کافر زمین دار نے بڑا داؤ کھیلا۔ اس نے قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جن دنوں جماعتیں مقابلہ پر آجائیں گی تو چار ہزار بہادروں کا گروہ لے کر مدد کو پہنچوں گا۔ جب مقابلہ کی نوبت آئی تو اس زمین دار کی قسموں پر بھروسہ کر کے اس دیانت دار عالم نے اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سامنے سے تو بندوقوں اور توپوں سے چہروں اور سینوں پر نصاریٰ نے گولیاں برسائیں اور پیچھے سے اس غدار مکار زمین دار کی جماعت نے پشت و سرین کو پھوڑنا شروع کیا۔ وہ در اصل نصاریٰ کے انصار و اعوان اور شیاطین کے اتباع و اخوان تھے۔ وہ خدا پرست عالم معرکہ میں گر کر شہید ہوا اور اس کی ساری جماعت نے بھی اسی کے نقش قدم پر چل کر جامِ شہادت نوش کیا۔'' (نفس مصدر، ص:69)

ضرورت ہے کہ حقائق اجاگر کیے جائیں، انگریزوں کے ہم نوا چہرے بے نقاب کیے جائیں۔ جن علما نے شمع آزادی کو فروزاں کیا ان کی خدمات اور کارناموں سے نئی نسل کو واقف کرایا جائے، نیز مشرکین کی فتنہ پردازیوں کو واشگاف کیا جائے۔

انقلاب 1857ء میں
فارسی اخبارات کا کردار

محمد ساجد رضا مصباحی

ہندستانی تہذیب وثقافت پر فارسی زبان وادب نے وسیع اثرات مرتب کیے ہیں۔ ہندستان کی گزشتہ ایک ہزار سالہ تاریخ پر نظر ڈالیں تو حکومت وسیاست، سماج ومعاشرہ، تصنیف وتالیف ہر میدان میں فارسی زبان وادب کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ فارسی زبان کا اصل مولد ومنشا ایران ہے۔ لیکن اس کی تعمیر وترقی اور ترویج واشاعت میں ہندستان کا بھی اہم رول رہا ہے، اس ضمن میں ہندستان کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ دنیا کا پہلا فارسی اخبار ''مرأۃ الاخبار'' 1822ء میں یہیں سے جاری ہوا اور ملکی، ملی، سماجی وسیاسی مسائل پر اپنے گراں قدر تبصروں کے ذریعہ لوگوں کے ذہن ودماغ پر اچھا اثر قائم کیا اور ایک طویل عرصے تک مقبولِ خاص وعام رہا۔ لیکن بالآخر انگریز حکام کی بدنظمی اور سرکاری افسران کے جبر وظلم کو طشت ازبام کرنے کے جرم میں حکومت کی جانب سے اس کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی اور ہندستان کا یہ اولین فارسی اخبار ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

مرأۃ الاخبار کے بارے میں ہندستان سے ملک بدر ہونے والے حق گو انگریز صحافی اور ''کلکتہ جرنل'' کے ایڈیٹر مسٹر جیمس سلک بکنگھم نے 20/اپریل 1822ء کے اداریے میں لکھا:

''دیسی زبانوں میں اب تک جتنے اخبارات شائع ہوئے ہیں ان میں ''مرأۃ الاخبار'' ہی ایک ایسا واحد اخبار ہے جس نے ہمارے دل ودماغ پر اچھا اثر چھوڑا ہے۔'' (ماہنامہ آج کل، شمارہ مئی 1998ء ص:17)

مرأۃ الاخبار کی عظیم پیش رفت کا سہرا راجا رام موہن رائے کے سر ہے، جنھوں نے فارسی کے ساتھ ہندی اور بنگلہ زبانوں میں بھی اخبارات جاری کیے۔ ہندستان میں فارسی اور دوسری مقامی زبانوں میں اخبارات کے اجرا کا اہم فائدہ یہ ہوا کہ انگریزی اخبارات جو حکومت کے ہر غلط وصحیح اقدام کا جواز تلاش کرنے کے لیے اپنی پوری توانائی صرف کر دیتے تھے، مقامی زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات نے ان کا سختی سے تعاقب شروع کیا، نیز انگریز افسران اور حکام کے ظلم وجبر کے خلاف انتہائی سخت رویہ اختیار کیا۔ یہ شدت 1856ء میں اودھ ریاست کے انگریزی حکومت میں انضمام اور 1857ء میں جنگ پلاسی کے موقع پر نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ مشہور مستشرق گارسین دتاسی نے مقامی اخبارات کے اس طرزِ عمل کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''ان منحوس کارتوسوں کی تقسیم کے موقع پر ہندستانی اخباروں نے جو بددلی پھیلانے میں پہلے ہی سے مستعدی دکھا رہے تھے، اپنی غیر محدود آزادی سے فائدہ اٹھایا اور اہلِ ہند کو کارتوسوں کے ہاتھ لگانے سے انکار کرنے پر آمادہ کیا اور یہ باور کرا دیا کہ اس حیلے سے انگریز ہندستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔''

(خطبات، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد 1935ء، ص:218)

مقامی اخبارات کی اس جرأت وبے باکی اور ہمت مردانہ کا شکوہ کرتے ہوئے اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے لکھا تھا:

''دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا۔''

p.183Donough, Historu of Law and Sedition.)

بحوالہ ماہنامہ آج کل شمارہ مئی 2007ء ص:39)

فارسی اخبارات نے روزِ اول ہی سے انگریزوں کے خلاف سخت لب ولہجہ اختیار کیا تھا۔ یہ اخبارات ان کے ہر اقدام اور ہر رویے پر کڑی نگاہ رکھتے۔ ان کے خطرناک عزائم اور خفیہ منصوبوں سے عوام کو باخبر کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے، گاہے بگاہے ایسے تبصرے اور ایسی خبریں شائع کرتے جن سے ہندستانی باشندوں کے دلوں میں نفرت وعداوت کا شعلہ بھڑک اٹھتا۔ جنگ کے دنوں میں ان اخبارات کے تیور اور لب ولہجے میں مزید سختی آ گئی۔ چناں چہ جے. لانگ J. Long نے 1859ء کی رپورٹ میں ہندستانی اخبارات کے طرزِ عمل اور لب ولہجے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''دیسی اخبارات کو مجموعی طور پر سیفٹی والیا (Safety Valve) کہا جا سکتا ہے جو خطرے کی وارننگ دیتا ہے۔'' (Sen

S.P. Dr., The Indian Press (ed) Institute of Historical Studies, Calcutta بحوالہ ماہنامہ آج کل، نئی دہلی، شمارہ مئی 2007ء، ص:40)

اس دور کے فارسی اخبارات میں ایک اہم نام ''سلطان الاخبار'' کا ہے جو رجب علی حسینی کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ اخبار انتہائی جرأت مندی اور دیدہ دلیری کے ساتھ خبریں شائع کیا کرتا تھا اور انگریزوں کی ظلم وزیادتی، جبر واستبداد، تعصب وفریب کو طشت ازبام کرنے کے لیے ملک بھر میں شہرت رکھتا تھا۔ 2/ستمبر 1835ء کے شمارے میں ''خبر رسم وعاداتِ انگریزاں در ممالک ہندستان'' کے عنوان سے تین صفحات پر مشتمل ایک انقلابی مضمون شائع کیا گیا، جس میں ہندستانیوں پر انگریزوں کے مظالم اور متعصبانہ رویوں کو ذکر کرنے کے ساتھ اہلِ وطن کی غیرت وحمیت کو بھی جھنجھوڑا گیا تھا کہ مٹھی بھر انگریز ہمارے وطن میں آ کر ہم پر ہر طرح سے ظلم وجبر کر رہے ہیں اور ہم بے چون وچرا ان کے ہر جائز وناجائز اقدام کو برداشت کر لیتے ہیں، اس مضمون کی چند سطریں پیش ہیں:

''مردم می گویند کہ انگریزاں قلیل وکم تر اند و ہندستانیاں کثیر وبیش تر ودر سرکار انگریز بہادر تدارک وعدل ہمیں است کہ ہر کرا کشندہ می دانند می کشند، لیکن عجب است کہ دریں معنی غور وتامل بکار نہ برند کہ آخر ہر جا کارکنان انگریزی دگری ودمس وقید وقتل وقصاص واخراجِ ملک وضبط تمغا وملک می سازند وکس دم نمی زند۔'' (سلطان الاخبار، 2/ستمبر 1835ء، شمارہ:8)

اوائل اگست 1833ء میں بنگال میں ایک سنسنی خیز واقعہ رونما ہوا۔ ہوا یوں کہ ایک انگریز تاجر نے ایک بنگالی دوشیزہ کے ساتھ زنا بالجبر کیا۔ مظلوم دوشیزہ کے اہلِ خاندان نے معاملہ سرکاری عدالت میں پیش کیا اور انصاف کی فریاد کی۔ لیکن جب معاملے کا علم ملزم تاجر کو ہوا تو اس نے پولیس سے ساز باز کر کے لڑکی کے پورے خاندان والوں پر چوری کا الزام لگا کر قید میں بند کروا دیا۔ مقامی لوگوں میں اس اندوہ ناک واقعہ سے غم وغصے کی لہر دوڑ گئی۔ سلطان الاخبار نے یکم اگست 1833ء کے شمارے میں عدالت کے اس غیر منصفانہ رویے اور پولس کی غیر انسانی حرکت پر کھل کر تبصرہ کیا اور ''خبر عدالت کلکتہ'' کی شہ سرخی کے ساتھ اس واقعے کی رپورٹنگ ان الفاظ میں کی:

''شنیدہ ام کہ دختر ہندوی بحضور حاکم مرافعہ برد کہ فلاں انگریز تاجر نیل خواہرم را از کنار آب در ربود و آغوش خویشتن از تن آں نازک بدن گرم نمود، مادرم و برادرم ازیں واقعہ در آتش کدۂ غم افتادہ اند وازیں پردہ دری وبے ناموسی چو شمع لگن بہ سوختند۔''

(سلطان الاخبار یکم اگست 1833ء شمارہ:1)

اس بے گناہ دوشیزہ کو نہ انصاف ملنا تھا، نہ ملا۔ اس کی ماں اپنی لختِ جگر کی عزت وناموس کے تار تار ہونے کے غم میں پس دیوار زنداں ہی راہیِ ملکِ عدم ہو گئی۔ انگریزی عدالت کی سفاکی پر سلطان الاخبار کے مدیر نے نہایت جرأت مندانہ جملہ لکھا:

''عوام ظن بردہ اند کہ شاید رعایت ابنائے جنس از انصاف بہتر است۔'' (ایضاً)

انگریزی حکومت سے عوام کی نفرت اور بے زاری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حکومت کے تمام شعبوں میں بدنظمی اور بے ضابطگی عام ہو چکی تھی، عوام کو چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے دفتروں کا چکر کاٹنا پڑتا، عدالتوں، کچہریوں اور سرکاری دفاتر کے افسران بغیر رشوت لیے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ ان بے راہ رویوں کا تجزیہ سلطان الاخبار نے کس جرأت وبے باکی کے ساتھ کیا ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

''از حال منشیان عدالت چہ نویسم کہ برہمہ چیرہ دست اند وسرہنگان شحنہ در عقوبت وآزار بہ بلا کوے وقت برابر نمایند، وعیش وشحنہ رئیس جفاکاران است و چپراسیان پرمٹ از نقد بازرگانان ومسافراں کیسہ

ندارند ونوکران خانہ ڈاک خصوصاً گرانیاں آں جا در
خیانت بے باک اند، اگر مظلومے بہ حضور حکام
مرافعہ بردیا شکایت نمایند حکام اعماض فرمایند، بے
چارہ را از بارگاہ می رانند۔''

(سلطان الاخبار 9/اگست 1833ء شمارہ:1)

انگریز جیسے سفاک اور ظالم و جابر حکومت کی ماتحتی میں رہ کر ان کی خامیوں اور ظالمانہ طرزِ عمل پر ایسا بے لاگ تبصرہ بڑے دل گردے اور نہایت ہمت و جرأت کا کام ہے۔ اُس رستاخیز ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر اسے جہاد بالقلم ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اس دور کے جن فارسی اخبارات نے ہندستانیوں کے دلوں میں حریت کا جذبہ بیدار کرنے اور انگریزی سامراج کی ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں ایک معروف نام اخبار ''ماہ عالم افروز'' کا ہے، جس نے انتہائی جرأت مندی کے ساتھ انگریز عہدے داروں کی بد اعمالیوں ، بدانتظامیوں اور ناانصافیوں کے خلاف زبردست تحریک چلائی۔ ایک موقع پر جب ایک انگریز افسر کے ہاتھوں ایک ہندستانی خاتون کا قتل ہوگیا تو اخبار ''ماہ عالم افروز'' نے اس کی خبر ''خون ناگہانی'' کی سرخی کے ساتھ اس طرح شائع کی:

''شورِ محشر برپا شد و مرد ماں بریں واقعہ وقوف یافتند و
چوں مورِ ملخ بمشاہدہ زن مہلو کہ فراہم شدند، بعملہ پولس
آنجا خبر کردند بعد ازیں بصاحب مجسٹریٹ اطلاع ایں
معنی گردید۔'' (ماہ عالم افروز، یکم مارچ 1836ء)

قاتل افسر نے مجسٹریٹ افسر کے سامنے قتل کا اعتراف کرلیا اور فاضل مجسٹریٹ نے قتل عمد نہ ہونے کی وجہ سے قاتل کو سزا سے بری کردیا۔ اس جھوٹ اور فریب پر اخبار ماہ عالم افروز نے سخت نوٹس لیا اور بڑے تلخ انداز میں اپنے ردِعمل کا اظہار اس طرح کیا:

''صاحب مجسٹریٹ پاس قومیت خود فرمودہ قاتل را
کہ متمول بود بلا جرم و تصور از علت خون بے گناہی
مخلصی دادند۔ اگر کسے مردِ غریب و از قومیت دیگر
بودے البتہ سپرد دورہ می شدے و پنج و شش ماہ حاجت و
حوالات بسر اوقات خود ساختے۔'' (ایضاً)

اس کے علاوہ بھی متعدد فارسی اخبارات تھے جنھوں نے برادرانِ وطن کے دلوں میں ملک کی آزادی کا نیا جوش وولولہ پیدا کر دیا تھا، جن کی انقلابی تحریروں کے سبب 1857ء کا انقلاب برپا ہونے سے قبل ہی انگریزوں کو اس کی روح فرسا بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔ ان اخبارات میں ''احسن الاخبار، سراج الاخبار، آئینۂ سکندر، دوربین'' وغیرہ کا نام خاص طور پر ملتا ہے، لیکن گلشن نوبہار نامی اخباران میں سب سے جری اور بے باک تھا۔ اس کے مدیر باتدبیر عبدالقادر اپنی حق گوئی اور حکمتِ عملی کے لیے مشہور تھے۔ عین اس زمانے میں جب کہ انگریزوں کے خلاف ہندستانی متحد ہو چکے تھے اور نفرت و عداوت کی آگ شعلہ زن ہو چکی تھی، بعض اخباروں نے اس قسم کی خبریں چھاپیں کہ اودھ کی طرح ریاست ٹراونکور کو بھی بدانتظامی کی وجہ سے سرکار ضبط کرنے والی ہے، اسی طرح الور کا علاقہ بھی سرکاری قلمرو میں شامل کرلیا جائے گا۔ اس خبر پر ''گلشن نو بہار'' کے ایڈیٹر نے نہایت طنزیہ تبصرہ لکھا، جس کے اردو ترجمے کا ایک حصہ پیش ہے:

''پہلے تو حکومت کو چاہیے کہ اس فتنہ وفساد کو روکے جو
ہندستان کے چپہ چپہ میں پھیل گیا ہے، اس کے بعد ہی
جہاں گیری کی حرص وہوس دل میں لائے، کرمان کو چٹ
کر جانے کی ہوس میں نے کی تھی لیکن اچانک یہ کیڑے
میرا ہی سر چاٹ گئے۔'' (انڈین ایمپائر، جلد اول، ص:23)

اس زمانے کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اپنے ایک خط (14/جولائی 1857ء) میں کورٹ آف ڈائریکٹرس کو حالات سے باخبر کرتے ہوئے ''گلشن نوبہار'' کا بھی تذکرہ کیا ہے۔''

''کلکتہ کے ایک لیتھوگرافکس پریس کا اجازت نامہ بھی
ہم نے منسوخ کر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اس چھاپہ
خانے کا تمام سامان ضبط کرلیا جائے، یہ قدم ہم نے
اس لیے اٹھایا کہ اس چھاپہ خانے میں ایک فارسی
اخبار ''گلشن نو بہار'' چھپتا تھا، جس میں 21/ماہ حال کو
انتہائی باغیانہ مضامین شائع ہوئے تھے۔''

(متذکرہ ص:405از محمد عتیق صدیقی)

یہ پابندی اور قرقی صرف اخبار ''گلشن نو بہار'' ہی کے ساتھ خاص نہیں تھا بلکہ انھیں دنوں دوسرے فارسی اور مقامی اخبارات پر پابندی عائد کردی گئی۔......

(باقی ص:58 پر)......

پہلی جنگِ آزادی اور اردو ادب

ڈاکٹر خواجہ اکرام

ادب کے حوالے سے بار ہا یہ سوالات اٹھتے رہے ہیں کہ ادب اپنی نوعیت کے اعتبار سے کیا ہے۔ کیا ادب محض ذوقِ جمال کی تسکین کا ذریعہ ہے یا ادب معاشرتی اقدار اور ہم عصر مسائل کا عکاس ہے۔ یہ سوالات کلاسیکی دور سے ہی کئی زاویوں سے ادب کی اہمیت وافادیت پر سوالیہ نشان قائم کرتے رہے ہیں۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے تناظر میں جو بحثیں ہوئی ہیں اس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ضرور ہے کہ دونوں طرح کی ادبیات کا اپنا اپنا مقام ہے۔ دونوں نظریات کے تحت تخلیق کیے جانے والے ادب میں یادگار زمانہ اور شاہ کار تصانیف بھی موجود ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا نے اسی ادب کو زیادہ سراہا جس ادب نے ہم عصر مسائل، تقاضے، رجحانات اور رویوں کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔ ادب کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ ہر ادب اپنا ایک علاقہ اور اپنی مخصوص تہذیبی شناخت رکھتا ہے۔ گویا ہر خطے کا ادب اپنی تہذیب وثقافت کے ساتھ زندہ وتابندہ رہتا ہے۔ ادب کو تہذیب سے اور تہذیب کو ادب سے الگ کر دیکھا نہیں جا سکتا۔ ادب کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ادب کی تخلیق انسان کرتا ہے اور انسان جس معاشرے، تہذیب اور ثقافت کا پروردہ ہوتا ہے، اسی معاشرے اور تہذیب کی عکاسی ادب میں ہوتی ہے۔ ادب چوں کہ خلا میں تخلیق نہیں کیا جاتا، لہٰذا جس طرح کا ادب بھی تخلیق کیا جائے گا اس میں کسی نہ کسی طور عہد کے حالات اور تہذیبی تناظر ضرور شامل رہیں گے۔ خواہ لکھنے والا محض ذوقِ جمال کی تسکین کے لیے یا تفریحِ طبع کے لیے ادب کی تخلیق کر رہا ہو۔ اس اعتبار سے دنیا کے کسی بھی ادب سے اس مخصوص خطے کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ معلوم کی جاسکتی ہے۔ لیکن جس ادب کی تخلیق سیاسی وسماجی حالات کو سامنے رکھ کر کی گئی ہو، اس ادب کو تاریخ کے بنیادی ماخذوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ہندستان کی پہلی جنگِ آزادی کے حوالے سے جب ہم اردو ادب کا جائزہ لینا چاہتے ہیں تو دراصل ہم اس ادب سے یہی تقاضا کرتے ہیں کہ اس ادب میں اس عظیم سانحے اور واقعے کے توسط سے بھی کچھ موجود ہونا چاہیے۔ گویا ہم بالواسطہ ادب سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ادب کو اپنے زمانے اور عہد کا نہ صرف عکاس ہونا چاہیے بلکہ اسے بے رحم نقاد بھی ہونا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ ہمارا ادب دراصل ہماری اپنی ذہنی اور فکری زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ ہمارا معاشرہ جس قدر ترقی یافتہ اور دوراندیش اور پیچیدہ ہوگا، ادب بھی اتنا ہی پیچیدہ اور ترقی یافتہ ہوگا۔ لیکن ادب کو اس مقام تک پہنچنے میں بھی کئی اہم مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں اس موضوع پر گفتگو کا مقام نہیں، لیکن اس پس منظر میں جب ہم اردو ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان وادب نے وطن کے سپاہیوں کے دوش بدوش اس جنگِ آزادی میں حصہ لیا ہے۔

اردو زبان اس عہد میں رابطے کی زبان تھی۔ اس زبان کو تخلیقی اعتبار سے دیگر علاقائی زبانوں میں امتیاز حاصل تھا، یہی وہ زبان تھی جس کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی البتہ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی زبانوں کو بھی حکومتی سطح پر اعزاز حاصل تھا۔ اس لیے اس عہد کے جتنے دستاویز ملتے ہیں وہ اردو، فارسی اور عربی زبان میں ہیں۔ ان زبانوں کے ذخیرے میں تاریخ کے ان تمام نشیب وفراز کی کہانی موجود ہے لیکن المیہ ہے کہ اس عہد کی تاریخ لکھنے والوں نے کبھی ان بنیادی ماخذوں کی طرف جھانکنے کی بھی غلطی نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کو نیست ونابود کرنے والوں نے خود ہی تاریخ لکھی اور جس طرح چاہا اسے مسخ کیا۔ اس پر طرہ یہ کہ ہمارے ملک کے تاریخ نویسوں نے بھی جب قلم اٹھایا تو انھیں مستشرقین کا حوالہ دیا، کیوں کہ آج بھی ہم اپنی باتوں میں سند کے لیے انھیں آقاؤں کا نام لیتے ہیں۔ یہ دراصل محکومیت کی نفسیات ہے، جس سے آج تک ہمارا پیچھا نہیں چھوٹا ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کو ڈیڑھ سو برس ہو چکے

اسسٹنٹ پروفیسر جواہرلال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

مگر ابھی تک ہم نے اپنی تاریخ کو اپنے حوالوں سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اگر ان سچائیوں کو ادب کے حوالے سے بھی دیکھیں تو بہت سے حقائق سے پردہ ابھی بھی اٹھ سکتا ہے۔

اردو ادب کی تمام اصناف میں اس اہم تاریخ کے حوالے موجود ہیں، کہیں بہت ہی واشگاف انداز میں ہیں تو کہیں محض اشاروں اور کنایوں میں ہیں۔ لیکن یہ رمزیاتی تحریریں بھی بخوبی عہد کے حالات کی غماز ہیں۔ خطوط، مضامین، کہانیاں، منظومات کے علاوہ صحافت کا بڑا رول رہا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں 1857ء سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ اس واقعے نے ایک طرف ملک کا سارا نظام بدل ڈالا تو دوسری جانب خود ہندستانیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ صدیوں سے بنی بنائی قدروں کو لمحوں میں۔ مشرقی تہذیب پر مغربی یلغار نے دانش وروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ عیسائیت کو حکومت کی سرپرستی میں فروغ دینے کی منضبط کوششوں نے ایک نیا محاذ کھول دیا، وہ جو دوسروں کی کفالت کرتے تھے اب خود ہی دو وقت کی روٹی کے لیے محتاج ہو گئے۔ اس معاشی پست حالی نے ہندستانیوں کی کمر توڑ دی۔ چوں کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لیے انھیں یہ خدشہ تھا کہ اگر یہ دوبارہ متحد ہو گئے تو ہم سے نہ صرف حکومت چھین لی جائے گی بلکہ ہمارا نام و نشان بھی مٹا دیا جائے گا۔ اس لیے ان کا One Point پروگرام تھا کہ انھیں نفسیاتی اعتبار سے اتنا کم زور کر دو کہ یہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکیں۔ اسی منصوبے کے تحت انھوں نے مذہبی منافرت کا بھی سہارا لیا اور ہر محاذ پر خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی یا علمی انھیں محرومیوں کا سامنا کرنے پر مجبور کیا۔ وہ محبِ وطن جو وطن کی خاطر اپنی جان و مال کی بھی پروا نہیں کر رہے تھے، ایسے جاں نثاروں کی ان کے پاس ایک طویل فہرست تھی، حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد انھیں ایسی عبرت ناک سزائیں دیں کہ دیکھنے والا ان کی مخالفت کی سوچ بھی نہ سکے۔ اس اندوہ ناک صورتِ حال میں سب سے بڑی ضرورت تھی کہ عوام کو محرومی کے احساس سے نکالا جائے اور نفسیاتی اعتبار سے ٹوٹے بکھرے لوگوں کو ہمت و حوصلہ فراہم کیا جائے۔ اس وقت کسی بھی اقدام سے عوام الناس کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا تھا، جتنا کہ اس اقدام سے ہوا کہ اردو کے دانش وروں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور علمائے کرام نے کیا۔ ان تفصیلات سے قبل جملۂ معترضہ کے طور پر یہ ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ آج ادب کے طالب علم اپنے اسلاف کے ان کارناموں کو پڑھ کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے یہ پوچھا جائے کہ اس حوالے سے آپ کتنے نام گنا سکیں گے تو شاید وہ پانچ دس نام کے بعد آگے نہ بڑھ سکیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ان ناموں میں ایک طبقے کو سرے سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وہ ہے علمائے کرام کی تحریریں۔ 1857ء کے حوالے سے اردو ادب کا بہت ہی وقیع ذخیرہ ہے مگر المیہ ہے کہ ہم تعصبات کے شکار ہیں۔ ہم نے علما کی تحریروں کو یکسر نظر انداز کیا ہے اور اسے ادب کے دائرے ہی سے خارج کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خود اپنا سرمایہ ہم اپنے ہاتھوں ضائع کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی بھی جو کچھ موجود ہے اس میں بھی علما اور مذہبی شخصیات کی تحریریں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔

1857ء کی ناکام جنگ کے بعد ادیبوں کی جانب سے طرح طرح کے ردِ عمل سامنے آئے۔ 1860ء ہی میں ''فغانِ دہلی'' کے نام سے شاعری کا مجموعہ سامنے آیا جس میں بیش تر ایسے شاعروں کا کلام ہے جو خود اس جنگ میں عملی طور پر شامل رہے۔ ''الہ آباد میں شورش کے موقعے پر جو اشتہار بنام شامِ اودھ اور دیگر مقامات قرب و جوار میں مشتہر کیے گئے تھے ان میں سے پنڈت کنہیا لال نے محاربۂ نظر (ص:300) میں نقل کیا ہے۔ یہ دونوں اشتہار اردو میں ہیں، ایک نثر میں ہے اور ایک نظم میں۔'' یہ اشتہار اس طرح ہے:

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمعِ بلاد
اہلِ اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
ہے جو قرآن و احادیث میں خوبیِ جہاد
ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا اسے کر لو یاد
فرض ہے تم پہ مسلمانو، جہادِ کفار
اس کا سامان کرو جلد، اگر ہو دیں دار
جو نہ خود جائے لڑائی میں نہ خرچے کچھ مال
اس پہ ڈالے گا خدا پیش تر از مرگ وبال
جو رہِ حق میں ہوے ٹکڑے، نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں جنت میں خوشی کرتے ہیں
حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثل دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں
اے مسلمانو! سنی تم نے جو خوبیِ جہاد
چلو اب ان کی طرف مت کرو گھر بھر کو یاد

کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹخاؤ گے
اپنی سستی کا جز افسوس نہ پھل پاؤ گے
بارہ سو سال کے بعد آئی یہ دولت آگے
حیف اس دولتِ بیدار سے مومن بھاگے
یعنی اسباب لڑائی کا جو کچھ تھا درکار
سب دیا تو نے ہمیں اور کیا پھر سردار
بات ہم کام کی کہتے ہیں، سنو اے یارو
وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ کر مارو

(بحوالہ ہندستان کی جنگ آزادی اور اردو شاعری، گوپی چند نارنگ)

مومن خاں مومن دہلوی بھی اس یورش کے عینی شاہدین میں سے ہیں۔ انگریزوں کی بڑھتی طاقت کے پیشِ نظر انھیں دہلی اور لال قلعہ کی تباہی کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا، اسی لیے انھوں نے بھی وہی باتیں کہیں جو اس وقت تمام علما و مفتیان اور دانش وروں نے کہی تھی۔ ان کے مطابق انگریزوں سے لڑنا ایک طرح کا جہاد تھا، اور لوگ جہاد سمجھ کر ہی اس میں شریک ہو رہے تھے۔ آج کا معاملہ یہ ہے کہ اس لفظ کو اس حد تک بے حرمت کر دیا گیا ہے کہ جہاد کے نام سے لوگ مسلمانوں کو گویا دشنام دیتے ہیں (یہ بحث طلب موضوع ہے جس پر گفتگو ہونی چاہیے)، لیکن آپ یہ ملاحظہ فرمائیں کہ اس وقت ملک کی حفاظت کے لیے اسی جذبۂ جہاد نے لوگوں کو مجتمع کیا اور اپنے ملک کی حفاظت میں خون کا ایک ایک قطرہ بھی نچھاور کر دیا۔ انگریزوں کے خلاف اسی جہاد کی تلقین کرتے ہوئے مومن نے مثنوی جہادیہ لکھی جس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرے — حیاتِ ابد ہے جو اس دم مرے
سعادت ہے جو جاں فشانی کرے — یہاں اور وہاں کامرانی کرے
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار — پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں — مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

مومن نے صرف یہ مثنوی ہی نہیں لکھی بلکہ کئی جگہوں پر اس کا ذکر کیا۔ ان کے یہ اشعار بھی دیکھیں۔

مومن تمھیں کچھ بھی ہے جو پاسِ ایماں
ہے معرکہ جہاد چل دیجیے وہاں

انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز
وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

صہبائی نے دلی کے لٹ جانے کے بعد کے درد کو جس انداز میں اپنے اشعار میں پیش کیا ہے وہ انتہائی کرب انگیز ہے۔ انھوں نے ذیل کے اشعار میں ان شہزادیوں اور رئیسوں کی بدحالی کا ذکر کیا ہے کہ جنھوں نے کبھی کوئی تکلیف نہیں دیکھی۔ آج ان کا کیا حال ہے ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیں۔

زیور الماس کا تھا جن سے نہ پہنا جاتا
بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
گاج کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا
لاکھ حکمت سے اوڑھاتے تو نہ اوڑھا جاتا
سر پہ وہ بوجھ لیے چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے تو پھر گرتے ہیں
طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پائی
مہندی ہاتھوں میں لگا سوتے تو کیا گھبراتی
شام سے صبح تلک نیند نہ ان کو آتی
ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی
ان کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اٹھایا تو سرہانے رکھا
روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر، جی ہی پہ بن آتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

(فغانِ دہلی)

اور غالبِ خستہ حال نے غدر کے بعد کے منظر کو اس طرح بیان کیا ہے۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے پیہم
ماجرہ دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

داغ دہلوی جو حسن وشباب کے شاعر سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے بھی اس تاراجی کی داستان کو دردانگیز لہجے میں لکھا۔ ان کے شہر آشوب کے چند بند ملاحظہ ہوں، جن میں انھوں نے پہلے دہلی کی شان وشوکت کو بیان کیا ہے، پھر میرٹھ میں وطن پرستوں کی بغاوت کو بیان کرتے ہوئے ان کے دلی آنے کا ذکر کیا ہے اور پھر اس کے بعد دلی کی تباہی کا منظر پیش کیا ہے۔

یہ شہر وہ ہے کہ ہر انس و جان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدر دان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندستان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا
رہی نہ آدھی یہاں سنگ وخشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت
فلک نے قہر وغضب تاک تاک کر ڈالا
تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکا یک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا
غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا
جلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں
برنگِ بوے گل اہلِ چمن چمن سے چلے
غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بے چارے کس چلن سے چلے
قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے

مقامِ امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی
غضب ہے بختِ بد ایسے ہمارے ہو جائیں
کہ ہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہو جائیں
جو دانے چاہیں تو خرمن شرارے ہو جائیں
جو پانی مانگیں دریا کنارے ہو جائیں
پئیں جو آبِ بقا بھی تو زہر ہو جائے
جو چاہیں رحمتِ باری تو قہر ہو جائے

(فغانِ دہلی)

منیر شکوہ آبادی بھی ایسے ہی شاعروں میں شامل تھے جنھوں نے اس ہنگامے کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اس سے متاثر بھی ہوئے۔ یہ نواب باندہ کے مصاحب تھے۔ ان کی گرفتاری کے بعد مرزا ولایت حسین کے ساتھ فرخ آباد میں قید کر لیے گئے اور ان پر مقدمہ چلتا رہا۔ اس کی تفصیل خود ان کے اشعار میں ملاحظہ فرمائیں۔

فرخ آباد اور یارانِ شفیق — چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے
آئے باندے میں مقید ہو کے ہم — سو طرح کی ذلت وتحقیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثلِ قبر — تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
پھر الہ آباد لے جائے گئے — ظلم سے، تلبیس سے، تزویر سے
جو الہ آباد میں گزرے ستم — ہیں فزوں تقریر سے، تحریر سے
پھر ہوئے کلکتے کو پیدل رواں — گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں، بیڑی پاؤں میں — ناتواں تر قیس کی تصویر سے

سوے مشرق لائے مغرب سے مجھے
تھی غرض تشہیر کو تقدیر سے

یہ چند مثالیں کافی ہیں یہ بتانے کے لیے کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اس جنگ آزادی میں عملی طور پر شرکت کی اور اپنے فن سے اور اپنے قلم سے سوئے ہوئے لوگوں کو جگانے کی بھر پور کوشش کی۔ اردو ادب کے بالاستعاب مطالعے سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ اس ادب میں اس عہد کی پوری تاریخ موجود ہے جسے اب تک نظر انداز کیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان بنیادی حوالوں کو استعمال کر کے تاریخ کی غلطیوں کو درست کیا جائے تا کہ وطن کے جاں باز جنھوں نے اپنے جان ومال کی قربانی پیش کی ہے ان کا نام تو نئی نسل جان سکے۔ ☆☆☆☆

تحریک 1857 میں
اردو کا عملی کردار

مہتاب پیامی

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے (غالب)

تحریکیں کامیاب ہوں یا ناکام، بہر حال یاد کی جاتی ہیں، اور ایک زندہ قوم کے لیے ان کا یاد رکھنا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس سے سبق حاصل کر سکے اور ماضی میں ہونے والی غلطیوں کا اعادہ نہ ہو۔ تحریک 1857ء کو ہندستان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا، محض اس لیے نہیں کہ یہ ایک ناکام تحریک تھی، بلکہ اس لیے کہ اس تحریک کی ناکامی نے مستقبل کی کامیابیوں کی داستان رقم کی۔

اردو زبان ایک زندہ زبان کی حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہے اور ایک زندہ زبان ہمیشہ سماج اور معاشرے کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ تحریک 1857ء میں اردو زبان و ادب کا ایک خاص کردار رہا۔ 1857ء سے پہلے کی سیاسی، سماجی اور معاشی ابتری کے اظہار کا وسیلہ بھی یہی زبان تھی اور 1857ء کی تحریک میں شامل بیش تر لوگوں کی زبان بھی یہی تھی۔

مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد ہندستان میں مختلف قسم کی باغیانہ طاقتوں کو فروغ حاصل ہوا اور سارے ملک میں وہ ابتری پھیلی کہ الاماں۔ سات سمندر پار سے آئے ہوئے تاجر نما موقع پرست لٹیرے ان حالات کا فائدہ کیوں کر نہ اٹھاتے۔ چناں چہ ان کی ریشہ دوانیوں سے سیاسی ومعاشرتی زوال کے ساتھ اقتصادی بے چینی اور بے روزگاری میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور جب ناصر الدین محمد شاہ کے دور میں نادر شاہ نے دلی پر حملہ کیا تو مغلیہ سلطنت کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو گئی۔

ملک کے ان ابتر حالات سے متاثر ہو کر شاہ ولی اللہ دہلوی نے ایک تحریک شروع کی جو مذہبی بھی تھی اور سیاسی بھی۔ وہ ملک کے موجودہ اقتصادی نظام کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی رائے میں مغلیہ سلطنت کے زوال میں جس قدر اقتصادی بدنظمی کا دخل تھا، اتنا دوسرے عوامل کو نہیں۔ ان کا قول تھا کہ جس سماج میں اقتصادی توازن نہ ہو وہ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ ان کی تحریک ناکام رہی ورنہ شاید ہندستان کی تاریخ بہت مختلف ہوتی۔

اس دور میں بھی اردو شعر وادب نے سیاسی واقتصادی حالات کا اثر قبول کیا لیکن کم، کیوں کہ اس دور کے شعرا کو آج جیسی آزادیِ فکر وخیال اور آزادیِ بیان حاصل نہ تھی اور نہ حبِ وطن کا وہ تخیل پیدا ہوا تھا جو اَب ہے۔

قدیم اردو شعرا نے اپنے دور کی عکاسی اپنے اشعار میں تو ضرور کی، مگر اشاروں کی زبان میں۔ ان اشاروں میں سب سے قدیم اشارہ راجا رام نرائن موزوں کا یہ شعر ہے جو انھوں نے نواب سراج الدولہ کی وفات پر کہا تھا۔

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

ان شعرا نے شہر آشوب بھی کہے، جن میں اپنے دور کی منظر نگاری کے ساتھ ساتھ حالات کے تئیں تنقیدی نقطۂ نظر بھی واضح ہے۔ اس سلسلے میں حاتم، سودا اور کمال الدین کمال کے شہر آشوب خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ شہر آشوبوں کے علاوہ مفرد اشعار میں بھی اس زمانے کی اقتصادی بے چینی اور سیاسی انتشار کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً شاہ مبارک آبرو کا یہ شعر۔

اب زمانہ ہے بے طرح بگڑا
کیا بنے روز گار کی صورت

نادر شاہ نے محمد شاہ رنگیلا کے دور میں دلی پر حملہ کیا اور اسے تاخت وتاراج کرنے کے بعد ہندستان کی قومی وراثت تخت طاؤس کو اپنے ساتھ افغانستان لے گیا۔ تخت طاؤس کے چھن جانے کا کرب عبدالحی تاباں کے اس شعر میں ملاحظہ فرمایئے۔

داغ ہے ہاتھ سے نادر کے مرا دل، تاباں
نہیں مقدور کہ جا چھین لوں تختِ طاؤس

دلی کی بربادی سے متاثر ہو کر مرزا غالب نے کہا۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

غالب نے مذکورہ بالا اشعار علاء الدین احمد خاں کو 1858ء میں لکھ کر بھیجے تھے، جو آگے چل کر دیوان میں شامل کیے گئے۔

اودھ کی تباہی بھی دہلی کی بربادی سے کسی طرح کم نہیں۔ آصف الدولہ کے تخت کے حق دار وزیر علی خاں تھے۔ سعادت علی خاں نے انگریزوں سے مل کر ان کے خلاف سازش رچی۔ سعادت علی خاں کی اس انگریز دوستی پر جرأت نے کہا۔

سمجھیں نہ امیر ان کو اہلِ توقیر
انگریز کے ہاتھوں سے قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں، وہی منہ سے بولیں
بنگالے کے مینا ہیں، یہ یورپ کے امیر

واجد علی شاہ اختر اور بہادر شاہ ظفر کے کلام میں شکوۂ غمِ روزگار کے عناصر کا غلبہ ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری حقیقتۂ ان کی اپنی آپ بیتی ہے، جس میں عصری اور سیاسی آگہی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اردو کے مشہور دانش ور شہنشاہ مرزا رقم طراز ہیں:

''بہادر شاہ ظفر کا سنِ پیدائش 1775ء بتایا جاتا ہے۔ ان کا انتقال رنگون میں جلاوطنی کے عالم میں 1862ء میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دلی بار بار اجڑی اور اجڑ اجڑ کر بسی۔ ظفر نے اس طوفانِ حوادث کا مشاہدہ بذاتِ خود کیا۔ وہ سلاطینِ تیموریہ کی شان دار وراثت کے امین تھے، اسے تباہ و برباد ہوتے ہوئے بھی انھیں کو دیکھنا پڑا۔ سیاسی افراتفری، قتل و غارت گری، خانہ جنگی اور تہذیبی بد حالی کے خوں چکاں واقعات سے اثر قبول کر کے ہی انھوں نے شعر کہے ہیں۔'' (ظفر کے کلام میں عصری اور سیاسی آگہی، از: شہنشاہ مرزا، ماہ نامہ نیا دور ڈائمنڈ جوبلی نمبر، ص:176-177)

بہادر شاہ ظفر کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

دشتِ وحشت کو ارادہ ہے کہ آباد کروں
کھول دے کاش مرے پاؤں کی زنجیر حریف
ہوا ہے فصلِ گل میں جوشِ وحشت اس قدر پیدا
کہ ہر موجِ ہوا پہنے ہوئے زنجیر پھرتی ہے
اے جنوں، توڑ کے زنجیر درِ زنداں کی
جی میں ہے، کھائیے اب چل کے بیاباں کی ہوا

دراصل بہادر شاہ ظفر نے اپنے کلام میں تحریک 1857ء کی پوری تاریخ دوہرائی ہے۔ وہ فطری شاعر تھے اور دلی واردات کے بیان پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کے کرب و اذیت کا آئینہ داریہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوے یار میں

یہ تو ہوئے غدر سے پہلے کے حالات۔ اب آیئے چلتے ہیں 1857ء کی طرف اور دیکھتے ہیں کہ کس طرح اس تاریخی تحریک میں اردو زبان و ادب نے عملی کردار ادا کیا۔

عوام میں حریت اور وطن دوستی کا جذبہ پیدا کرنے میں اخبارات کا نمایاں کردار ہوتا ہے۔ اردو کا پہلا اخبار ''جامِ جہاں نما'' 1823ء میں جاری ہوا اور مغلیہ سلطنت کے کلی زوال تک اردو زبان میں تقریباً 45/اخبارات جاری ہو چکے تھے۔ ''تاریخِ صحافتِ اردو'' کے مصنف رقم طراز ہیں:

''ہندستان کے اخبارات میں اردو اخبارات بھی مجموعی اعتبار سے آزاد خیال تھے اور بہت بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ بدیسی انگریزی حکومت کے خلاف جس قدر جذبہ پیدا کر سکتے تھے، وہ انھوں نے کیا۔ 1857ء میں ہندستانیوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جو بغاوت کی تھی اس کی زیادہ تر ذمہ داری گارسان ڈتاسی نے ان اخبارات پر عائد کی ہے۔'' (تاریخ صحافت اردو، ص:296)

اس سلسلے میں دو اخبارات کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر

ہیں۔ پہلا- صادق الاخبار، اور دوسرا- دہلی اردو اخبار۔ مقدمہ بہادر شاہ کے ایک سرکاری گواہ چنی لال کا بیان ہے کہ:

''جمال الدین ایک ہفتہ وار اخبار نکالتا تھا جس کے مضامین قطعی انگریزوں کے خلاف ہوتے تھے۔ اس اخبار کا نام صادق الاخبار تھا۔'' (بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ، ص:70 بہ حوالہ تاریخ صحافت اردو، ص:196)

صادق الاخبار میں اکثر ایسی خبریں شائع ہوتی تھیں جن میں انگریزوں کے جرم و تشدد کو ہائی لائٹ کیا جاتا تھا، یا ایسی خبروں کی اشاعت کی جاتی تھی جن میں انگریزوں کے خلاف سازش ہوتی تھی۔ مثلاً یکم نومبر 1840ء کے اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی:

''لاہور اخبار سے واضح ہوتا ہے کہ کنور صاحب (کنور نہال سنگھ) نے دوست محمد خاں (والیِ افغانستان) کو لکھا ہے کہ تمھارے ساتھ ہو کے میں مقابلہ انگریزی کا کروں اور فرزندِ خانِ مذکور کو طلب کیا ہے بہ ایں اقرار کہ میں اس کو فوج سکھ کا سپہ سالار بناؤں گا اور مشہور ہے کہ نیپالی لوگ بھی اس سازش میں شامل ہو جائیں گے۔'' (تاریخ صحافت اردو، ص:128)

اپنی حق گوئی کی پاداش میں جمال الدین، مہتمم صادق الاخبار کو متعدد بار معتوب ہونا پڑا۔ ''تاریخ صحافت اردو'' کے مصنف رقم طراز ہیں:

''اس جرم میں کہ وہ سرکار کی بدخواہی کی خبریں جھوٹی گڑھ کر لکھا کرتا تھا، تین برس کی قید ہوئی۔''

(بغاوت ہند، ص:285)

دہلی اردو اخبار میں ہندستانی ریاستوں اور دہلی دربار کی خبروں کے ساتھ ساتھ ان کی بدانتظامیوں پر سنجیدگی اور آزادی کے ساتھ تبصرے ہوتے تھے۔ اس اخبار کے مدیر برائی کے خلاف آواز بلند کرنے کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ ان کے ذہن میں امیر غریب، ہندو مسلم اور سکھ کا امتیاز نہیں تھا۔ (تاریخ صحافت اردو، ص:108)

دہلی اردو اخبار کے مالک اور مدیر محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر تھے۔ جب دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو محمد باقر کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ آزاد کے نام بھی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا تھا، لیکن وہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلے۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ادبا و شعرا ہندستان کی پہلی جنگ آزادی میں ہی دار و رسن کی آزمائش سے گزرے۔

غدر یا پہلی جنگ آزادی ہندستان کی سیاسی تاریخ میں ایک نیا موڑ ثابت ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ یہ جنگ منظم طریقے پر نہیں لڑی گئی، بعض طبقوں نے صرف شرکت ہی سے گریز نہیں کیا بلکہ انگریزوں کا ساتھ بھی دیا، جس کے نتیجے میں انھیں انگریزی سرکار سے وظائف جاری ہوئے اور انھیں ''شمس العلما'' اور ''سر'' جیسے خطابات سے بھی نوازا گیا۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ پہلی جنگ تھی جو ہندستانی لشکریوں اور عوام نے انگریزوں کے خلاف لڑی۔ انگریز غالب ضرور آئے مگر مقابلہ سخت تھا۔ آزادی کی اس جد و جہد کی زمین ہم وار کرنے اور عوام میں بیداری پیدا کرنے میں علما، ادبا اور شعرا کا نمایاں کردار رہا۔ ان میں امام بخش صہبائی، مولانا فضلِ حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور منیر شکوہ آبادی کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

تحریک 1857ء کے نام ور رہبر و مفتی صدر الدین خاں آزردہ اپنے وقت کے زبردست عالمِ دین تھے۔ انھوں نے اپنی نظم ''فغانِ دہلی'' میں شہیدانِ وطن کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر، جی ہی پہ بن آتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

آزردہ نے اپنی اس نظم میں شیخ امام بخش صہبائی اور مصطفیٰ خاں شیفتہ کا دردناک ذکر کیا ہے۔ شیفتہ کو بغاوت کے الزام میں انگریز سرکار نے سات برس قید کی سزا سنانے کے ساتھ ساتھ ان کی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائداد بھی ضبط کر لی تھی۔ 1857ء کے بعد دہلی کی بربادی کا نوحہ انھوں نے ''مرثیۂ دہلی'' کے عنوان سے پیش کیا۔ اس نظم کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

ہائے دہلی، و زہے دل شدگانِ دہلی
آپ جنت میں ہیں اور دل نگرانِ دہلی

وہی جلوہ نظر آتا ہے تصور میں ہمیں
مٹ گئے پھر بھی یہ باقی ہے نشانِ دہلی
کلّ یومٍ ھُوَ فِی شَان کی ہے جلوہ گری
کیا ہوا گر نہ رہے شوکت و شانِ دہلی
گر نہ کہویں کہ یہ دہلی ہے تو ہرگز نہ پڑے
دہلی والوں کو بھی دہلی پہ گمانِ دہلی
شیفتہ اور ستائش کے نہیں ہم خواہاں
یہی بس ہے کہ کہیں ہے یہ زبانِ دہلی

مذکورہ نظم ''فغانِ دہلی'' میں آزردہ نے امام بخش صہبائی کے ساتھ ہوئے بہمانہ سلوک کا ذکر بڑے پر درد انداز میں کیا ہے۔ امام بخش صہبائی بڑے پائے کے عالم تھے، عربی اور فارسی میں خاص کمال حاصل تھا۔ ان کی اردو نظموں نے تحریک کو زبردست تقویت پہنچائی تھی۔ دہلی پر قبضہ کے بعد انگریزی فوج نے پہلے تو انھیں بغاوت کے الزام میں گرفتار کیا، بعد میں انھیں اور ان کے اہلِ خاندان کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

ان کے علاوہ قربان علی بیگ سالک کی نظم ''فغانِ دہلی''، داغ دہلوی کی نظم ''فغانِ دہلی''، ظہیر دہلوی کی نظم ''مرثیۂ دہلی'' اور میر مہدی مجروح کی نظم ''مرثیۂ دہلی'' بھی اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔

1857ء کی تحریکِ آزادی میں حریت نوازوں نے فوجی افسروں کے نام یا لیڈروں نے ایک دوسرے کو جو پیغامات بھیجے، یا جو سرکلر (Circular) جاری ہوئے، وہ زیادہ تر اردو زبان میں تھے۔ یعنی تحریکِ آزادی کے تانے بانے میں اردو زبان کے گل بوٹے بہر گام اپنی رونقیں دکھا رہے تھے۔۔ اس طرح کے ایک دستاویزی خط کی نقل ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ خط شجاعت نشان کوتوال کے نام ایک حریت نواز سپہ سالار کا حکم نامہ ہے:

111c سلسلہ نمبر 45 29/ جولائی 1857ء

شجاعت نشان کوتوال شہر

تم کو لکھا جاتا ہے کہ گاؤ کھال یعنی چمڑا گایوں اور جانوروں کا اور چربی قصائیوں کے گھر پہ ہے، اس کی زبانی گنتی کروا دو اور فہرست اس کی لکھ کر حضور میں بھیج دو کہ کوئی فریب نہ کرے اور واسطے آئندہ کے گاؤ کشی کا کام بند کر دیا جائے، اور جو گاؤ کشی کرتے تھے اب وہ نہ کریں گے۔ اس میں کوئی گلہ تکرار نہ کرے، تاکید جانے۔''

یہ خط کس سپہ سالار کی جانب سے کس شہر کے کوتوال کے نام ہے، یہ معلوم نہیں ہوا۔ انڈین نیشنل آرکائیوز نئی دہلی کے دفتر میں انتہائی شکستہ حالت میں موجود ہے اور اس میں صرف وہی باتیں درج ہیں جو سطورِ بالا میں تحریر کی گئیں۔ لیکن اس خط سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جب کارتوس میں گائے اور خنزیر کی چربی کی آمیزش کا قضیہ اٹھا تو ہندو اور مسلمان دونوں فوجی اس سے برگشتہ ہوئے۔ اس وقت مسلمانوں میں گاؤ کشی عام تھی۔ فرنگی دشمن سے لڑنے کے لیے ضروری تھا کہ آپس میں اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا کی جائے۔ گاؤ ہندو قوم میں قابلِ احترام سمجھی جاتی تھی، اس لیے مسلم رہنماؤں نے جو دور اندیشانہ فیصلہ کیا وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ آپس میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے گاؤ کشی کو عمومی طور پر بند کر دیا گیا، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بیش تر مقامات پر ہندو اور مسلمان کندھے سے کندھا ملا کر دشمن کے سامنے آہنی دیوار کی طرح ڈٹے رہے۔

اب ذیل میں ہم وہ بہادر شاہی سرکلر پیش کر رہے ہیں جو کچہری سپہ سالار بہادر سے افسران پلٹن، رسالہ اور توپ خانہ جاری ہوا۔

منہ 1273 — مہر

مہر کچہری......اول پادشاہی — کچہری سپہ سالار بہادر

eksgjdpghj — سن 1273ھ

vkSoyiknkkgh

بنام افسران پلٹن و رسالہ و توپ خانہ وغیرہ آں کہ
تم کو لکھا جاتا ہے کہ اس وقت حکم حضور پرنور کا آیا کہ جو پلٹن اور رسالہ و توپ خانہ مورچہ کو سر کریں گے، اوس پلٹن اور رسالہ کی تنخواہ بموجب سررشتہ تنخواہ دیگر افواج کے زیادہ ملے گی اور تنخواہ کے سوائے انعام بہادری کا ملے گا۔ اب تم سب سرداران اور سپاہیان کو چاہیے کہ تم سب لوگ دلو (دل و) جان پیش کر کے اس مورچہ کو فتح کرو اور حضور پرنور سے انعام بہادری کا پاؤ۔ اس میں دیری نہو تاکید جانو مکرر یہ کہ جو شخص لڑائی میں جوجہ جاوے گا (شہید ہو جائے گا) اس کے وارثانِ حقیقی کی بخوبی پرورش ہوگی۔ حضور پرنور سے اطلاع پا کر مردماں ہوشیار رہیں۔

اسی سے ملتا جلتا دوسرا حکم نامہ جو ہمیں دستیاب ہوا، اس پر بھی کچہری سپہ سالار بہادر کی مہر ہے اور تاریخ 16/ محرم 1273ھ درج ہونے کے ساتھ ساتھ مقام ''دریا گنج'' بھی تحریر ہے۔ دریا گنج پرانی دہلی کا ایک مشہور و معروف مقام ہے اور مغل فوج کے سپہ سالار کا دفتر (کچہری) وہیں واقع تھا۔ اس حکم نامہ کے نیچے صوبے دار محمد عظیم جمعدار کے دستخط ہیں۔ اس خط میں فرنگیوں پر متحد ہو کر حملہ کرنے کا حکم درج ہے۔ ذیل میں اس حکم نامے کی چند سطریں ہم پیش کرتے ہیں:

''حسب الاحکام قضا فرجام حضرت جہاں پناہ سلامت کے تم لوگوں کو لکھا جاتا ہے کہ جو شخص فتح یاب اوپر پہاڑی کے ہوگا، مال و اسباب پوری پہاڑی کا سوائے مال میگزین و اسپان توپخانہ کے بالکل انلوگوں کو سرکار فیض آثار سے ملے گا۔''

مزید چند سطروں کے بعد متحد ہو کر حملہ کرنے کا حکم ہے۔

''اور سب لوگ ہر چہار طرف سے ہندو مسلمان پہاڑی کے اوپر دعویٰ کریں، کس واسطے کہ یہ لڑائی دین کی ہے۔''

اوپر ہم نے تحریر کیا کہ گائے کو ہندو قوم اپنی مذہبی علامت مانتی ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ مسلمان گاؤ کشی بند کر دیں۔ اس سلسلے کا ایک حکم نامہ ہم اوپر درج کر چکے ہیں۔ ذیل میں ایسے ہی ایک بہادر شاہی سرکلر سے ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے:

''حکم حضور والا صادر ہوا کہ ہندو کو گائے اور مسلمانوں کو سور کے لحاظ کر کے اور دین اور دھرم کو سمجھ کر بسکہ میری مرضی اور زندگی تمکو منظور ہو تو دیکھتے ہی اس حکم نامہ کے پلاٹن و رسالہ و توپ خانہ سب تیار کر کے اوپر کشمیری دروازہ کے حاضر ہو کر مخالفان نانہجار و کفاران بدافعال پے دھاوا کرو۔''

اس حکم نامے کی پیشانی پر بھی کچہری سپہ سالار بہادر کی مہر اور نیچے رسالہ سوئم کے کمانڈر سبحان خاں کے دستخط ہیں۔

اب جو سرکلر ہم پیش کرنا چاہتے ہیں وہ حریت نوازوں کے ایک مطبوعہ خط کی نقل ہے جو انھوں نے ممالک ہند کے راجاؤں اور نوابوں کے نام بھیجا تھا۔ یہ سرکلر اور درج بالا سطور کے تمام حکم نامے انڈین نیشنل آرکائیوز، دہلی میں محفوظ ہیں۔ اس سرکلر میں نوابوں اور راجاؤں کو دین اور دھرم کی اہمیت سمجھائی گئی ہے، جیسا کہ ہم اور آپ جانتے ہیں۔ تحریک 1857ء کا آغاز کارتوس میں گائے اور خنزیر کی چربی کی آمیزش کی خبر پھیلنے سے ہوا تھا۔ یہ معاملہ اگر ایک طرف مسلمانوں کو ناگوار تھا تو دوسری طرف ہندو قوم بھی اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ہر دو قوم اپنے اپنے مذہبی افعال میں انگریزوں کی دخل اندازی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ مذکورہ سرکلر میں ایسے معاملات کی نشان دہی کی گئی ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''یہ انگریز لوگ سب کے مذہب بگاڑنے والے ہیں، اس کو خوب جان لینا چاہیے کہ بہت دنوں سے دھرم ہندستان کے لوگوں کے بگاڑنے کے واسطے کتابیں بنا کر اپنے پادریوں کے ہاتھ سے ہندستان میں پھیلائیں اور دھرم کو ظاہر کرنے والے زور سے منگا لیتے ہیں، یہ انھیں کے معتبر آدمیوں سے سنا گیا، سو دیکھیے کہ دھرم بگاڑنے کی ریت انھوں نے کیسی تجویز کی ہے کہ اول جب عورت رانڈ ہوا وسکو بزور حکم دیا کہ دوسری شادی کرے۔''

ہندو قوم میں پھیلی ہوئی سماجی برائیوں جیسے ستی کی رسم اور بیوہ کی شادی جیسے معاملات کو بھی مذہب کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ اس خط میں اس طرح کی اور بھی بہت ساری باتیں ہیں۔ یہ خط جون 1857ء میں بہ اہتمام مولوی سید قطب شاہ صاحب مطبع بہادری شہر بریلی سے شائع ہوا تھا۔

انقلاب 1857ء کے پس پشت مولانا فضل حق خیر آبادی اور فتویٰ جہاد کا بھی زبردست کردار تھا۔ دہلی اور اطراف میں انقلاب کی لہر

کوہوا دینے میں اس فتویٔ جہاد نے بڑا کام کیا۔ اس طرح کا ایک اور فتویٰ حیدر آباد دکن سے جاری ہوا تھا۔ اس فتوے کی اصل کاپی انڈین نیشنل آرکائیوز دہلی میں محفوظ ہے، البتہ کاغذ شکستہ ہونے کے سبب جاری کرنے والے مفتی یا مفتیان کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں بتایا جاسکتا۔ ذیل میں اس فتوے کا ایک اقتباس پیش ہے:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ نصر من اللہ و فتح قریب، و بشر المومنین. اگر جو شخص کہ مسلمان ہوکر، کلمہ گو امتِ رسول ہوکر ارادۂ قتل کرنے اوس کافر دین یعنی فرنگی میں تامل کرے گا اوس پر طلاق اور وہ اولاد دھیڑ اور چمار، گدھے، کتے اور سور کے ہیں، بلکہ نسل یزید اور شمر کی اور بیٹا فرنگی کا ہوگا یا امیر یا دیوان یا مشائخ یا پیر زادہ یا مولوی یا قاضی یا مفتی یا صوبہ (صوبے دار)، یا کوتوال، یا رئیس یا خورد و کلاں کلہم عام و خاص ان سب پر قسم ہے اوس اللہ واحد کی اور اس کے حبیب کی اور جو کوئی شریک ہوکر اپنے سر کو سرخرو کرے گا البتہ و غازی اور قاتل کفار کہلاوے گا اور جو شخص کہ مارا جاوے گا انشاء اللہ تعالیٰ پس تحقیق داخل ہوگا وہ بیچ مجلسِ شہدا اور شریک ہوگا مجلس میں مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی، بے شک واسطے اوسکے بہشت اعلیٰ ہے۔"

غرض ہماری آزادی کی جدوجہد کا کوئی موڑ ایسا نہیں جہاں اردو اور اہلِ اردو نے اس کا ساتھ نہ دیا ہو۔ اردو والوں نے آزادی کی جدوجہد کو قومی دائرے تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کے دائرے بین الاقوام سے ملائے اور ایک زندہ، پائے دار اور ہمہ گیر شعور کو عام کیا۔ بقول مولانا ظفر علی خاں۔

انتم الاعلون کا غل مچ رہا ہے عرش پر
اور پرستارانِ حق کی قدسیوں میں دھوم ہے

☆☆☆☆☆

......(ص:48 کا بقیہ)......

اخبار کے مدیروں اور پریس کے مالکوں کو طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑا، بعض موت کے گھاٹ بھی اتار دیے گئے، بعض کے مال و متاع چھن قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ان احوال کی تصدیق ان سرکاری دستاویزوں سے بھی ہوجاتی ہے جو اب تک کسی نہ کسی طرح محفوظ ہیں۔ چناں چہ گورنمنٹ آف پنجاب کے ایک ریکارڈ میں ہے:

"پنجاب کے اخبارات پر بہ آسانی شدید سنسر عائد کر دیا گیا، پشاور میں "مرتضائی" کے ایڈیٹر کو باغیانہ مضامین لکھنے کے جرم میں قید کرکے اس کا اخبار بند کر دیا گیا۔ اسی طرح ملتان کے دیسی اخبار کی اشاعت بھی روک دی گئی۔ چشمۂ فیض کے ایڈیٹر کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اخبار کو سیال کوٹ سے لاہور منتقل کرے، جہاں پہلے ہی سے دو اخبار شائع ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی اس اخبار (چشمۂ فیض) کی بھی کڑی نگرانی کی گئی۔" (متذکرہ، ص:404 از محمد عتیق صدیقی)

10 رمئی 1857ء کو میرٹھ سے شورش کا سلسلہ نہایت زور و شور سے شروع ہوا۔ آزادی کے جیالوں نے وطنِ عزیز کی بازیابی کے لیے تن من دھن کی بازی لگادی اور پورے جوش و خروش کے ساتھ انگریزی جبر و استبداد کے سامنے سینہ سپر ہوگئے۔ اس دوران پیش آنے والے واقعات کی تفصیل اردو اور فارسی اخبارات میں نہیں ملتی، ہاں فارسی اخبار "سراج الاخبار" میں آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ فوجیوں کے براہِ راست رابطے کی خبر شائع ہوئی:

"سحر چوں خسرو خاور عالم بر کوہ ساران زد فرماں روائے اقلیم ہند دست دعا پیشِ داور داد (پس ازاں) شرف نبض شناسی بہ احترام الدولہ بہادر (حکیم احسن اللہ خاں بخشید ند و حضار دربار دی اقتدار حاضر بارگاہ شد نداہ" (سراج الاخبار، 11 رمئی 1857ء)

بلاشبہ ان اخبارات نے 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے لیے ہندستانیوں کی ذہن سازی کرنے اور ان کے دلوں میں روشن جذبۂ حریت کی چنگاری کو آتش فشاں بنانے میں جو اہم کردار ادا کیا وہ تاریخِ آزادی میں ہمیشہ درخشاں حروف میں جگمگاتا اور نئی نسلوں کو تابندگی عطا کرتا رہے گا۔

جنگِ آزادی کے سنی ادیب

اسد نظامی

1857ء کی جنگ آزادی میں جہاں علما و مشائخ، شعرائے اہلِ سنت نے فرنگی تسلط کے خلاف کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، وہیں سنی ادیب حضرات نے بھی برطانوی استعمار کے خلاف بہ ذریعۂ قلم جو بھرپور کردار انجام دیا ہے، اسے ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

بھلا دینا نہیں آساں شہیدوں کے زمانے کو
زمانہ چاہیے خونی نوشتوں کے مٹانے کو

ذیل میں چند ادیبوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

حضرت مولانا محمود الخیر انصاری القریشی شہید:

خطۂ ملتان کے مشہور علمی خاندان قوم انصاری (جو کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے ہے اور حضرت محمد بن قاسم کے ہم راہ سرزمینِ عرب سے ملتان میں قیام پذیر ہوا۔) کی مشہور و معروف علمی شخصیت حضرت علامہ قاضی محمود الخیر شاہ انصاری وہ شخصیت تھی جس نے اپنی خداداد صلاحیت کے پیشِ نظر اپنے مخصوص ادبی انداز میں برطانوی استعمار کے نام ہندستانی مسلمانوں کو پیغامِ بیداری دیا۔ اس اہم موضوع پر دستی یا پریس سے اشتہار، پمفلٹ یا کتابچے شائع کرنے کا جو اہم فریضہ انجام دیا، ان میں سے سرِ دست مختصر لفظوں میں "برطانوی استعمار کے نام" سے ایک اقتباس ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے:

"**برطانوی حکمرانوں کے مذموم ہتھ کنڈے**

برادرانِ اسلام! جب سے یہ برطانوی سامراج ہم پر مسلط ہونے کے خواب دیکھ رہے ہیں، بلکہ صوبہ بنگال اور دیگر متعدد علاقوں پر بہ زور دجل و سالوس کے مسلط ہو چکے ہیں، ایسا کرنے کا انھیں ہرگز حق نہیں تھا، کیوں کہ انگریز جہاں گیر کے دورِ حکومت میں بطور ایک مہمان کے آئے تھے، بطور حاکم نہیں۔

اے برطانوی حکام! تم غاصب ہو، ہمارے ملک کے بعض حصوں پر تم نے جو قبضہ کر رکھا ہے وہ سراسر ناجائز ہے۔ بالآخر بالادستی ہمیں حاصل ہوگی اور تمھیں ایک نہ ایک دن اس ہندستان سے بے نیل و مرام ہوکر واپس لوٹنا ہی پڑے گا۔

منجانب: انجمن مجاہدین اہل سنت و جماعت، ملتان شریف۔"[1]

حضرت مخدوم محمود الخیر شاہ شہید علیہ الرحمہ کی جرأت ملاحظہ فرمایئے کہ جو برطانوی سامراج کی پروا کیے بغیر باطل کے سامنے ڈٹ گیا، باطل کے زعم کو پاش پاش کرنے کا تہیہ کرکے میدانِ عمل میں آگیا۔ جب اسی قسم کے جرأت مندانہ اقدام کی وجہ سے اشتہارات کا سلسلہ شروع ہوا تو انگریزوں نے ایڈورڈ نامی ایک شخص اور دیگر سپاہیوں کو بھیج کر خونی برج ملتان کے قریب ایک مسجد میں آپ کو شہید کرادیا۔ تاریخِ شہادت 22 ررمضان المبارک ہے۔

حضرت قاضی پیر بخش جام پوری:

قصبہ جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں پنجاب کا وہ عظیم ہیرو گزرا ہے جس نے دنیائے سنیت کی بہترین خدمت کی ہے۔ آپ حضرت مولانا فضل امام خیر آبادی و مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔

آپ میں شعر و شاعری کے ذوق کے ساتھ ادبی ذوق کا جذبہ بھی کافی تھا۔ آپ ضلع ڈیرہ غازی خان میں برطانویوں کے خلاف بے شمار دستی اشتہارات لکھ کر در و دیوار پر رات کی تاریکی میں چسپاں کرتے تھے۔ چناں چہ آپ کی تحریر کا اقتباس بھی یہاں قارئین حضرات کی دل چسپی کے لیے درج کیا جاتا ہے:

"**میرے ہم وطن دوستو!**

یہ برطانوی استعمار جو روز بروز اپنا پاؤں پھیلائے جارہا ہے، جو کہ سکھا شاہی سے بھی بدترین ہے۔ سکھ تو گرو نانک کے پرستار تھے، یہ گورے تثلیث

پرست ہیں، جو کہ مسلمانوں کے لیے سم قاتل سے ہرگز کم نہیں، لہذا اسے اپنے ناپاک منصوبوں میں ہرگز کامیاب نہ کیا جائے بلکہ جہاں تک ہو سکے ان عیسائیوں کی حوصلہ شکنی کی جائے تا کہ یہ لوگ ہم پر مسلط نہ ہوسکیں۔

فقط والسلام مع الاکرام

فقیر پیر بخش قریشی جام پوری، ضلع ڈیرہ غازی خاں، پنجاب۔"[2]

جب اس قسم کے دستی اشتہارات برطانوی حاشیہ برداروں کے توسط سے برطانوی حکام کی نظر سے گزرے تو رات کی تاریکی میں ملتان سے ایک فوجی دستہ بھیجا گیا۔ مولانا پیر بخش قریشی اپنے گھر میں تشریف فرما تھے، برطانوی فوج نے گولیوں کی باڑ سے آپ کو شہید کر دیا۔

جناب امانت علی خاں چشتی نظامی، پاک پٹن شریف:

جناب امانت علی خاں چشتی شہید علیہ الرحمہ جو کہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن دیپال پوری کی اولاد امجاد میں سے تھے اور حضرت مخدوم وارث زبدالانبیا خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاندان سے بہ سلسلۂ چشتیہ منسلک تھے۔ جب برطانوی رام راج کا چرچا ہوا تو آپ نے بھی منظرِ عام پر آ کر برطانوی تسلط کے خلاف اپنی جدو جہد شروع کر دی۔

آپ بلند پائے کے عظیم ادیب تھے، آپ کی تحریروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ علم وادب میں آپ کا کس قدر ارفع و اعلیٰ مقام تھا کہ جس کو سمجھنے کے لیے چشمِ عقل خیرگی کی حالت میں ہے، ذہن عاجز ہے کہ ایسی بلند ہستیوں کا خدا جانے کیا مقام ہوگا۔

آپ نے برطانوی راج کے خلاف جو تحریریں قوم کے سامنے پیش کیں ان میں سے صرف چند سطور حسب ذیل درج ہیں:

"**برادرانِ اسلام!**

کہ ملک ما ہند فرنگی تثلیث پرستان روز بروز حاوی می شدہ اند۔ ایں فرنگیاں می خواہند کہ بر ملکِ ہندوستان مسلط شدیم و حکم تثلیث پرستی نافذ بکنیم واز قلوبِ مسلماناں جذبۂ جہاد را کالعدم قرار دادیم۔ ایں مذموم منصوبہ است لہذا با ایں فرنگیانِ تثلیث پرستان جہاد کردن از حد ضروری است واز میدانِ جہاد فرار شدن و حاشیہ آرائی فرنگیان کردن ہرگز روا نیست۔

خادم درگہِ فرید

فقیر امانت علی چشتی، پاک پٹن شریف، پنجاب

یکم ماہ محرم الحرام 1272ھ۔"[3]

جناب میاں فضل کریم بدایونی شہید:

آپ حضرت مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی علیہ الرحمہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ آپ حسب الامر حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمہ برطانوی سامراج کے خلاف میدانِ علم و عمل میں نبرد آزما ہوئے۔ آپ جید عالمِ دین ہونے کے علاوہ ایک زبردست ادیب شہیر تھے۔ صاحب رسالہ ذوالقرنین بدایوں نے اس طرح لکھا ہے:

"حضرت مولانا میاں فضل کریم صاحب بدایونی شہید علیہ الرحمہ نے ادبی رنگ میں جس طرح برطانوی ادیبوں کا مقابلہ کیا ہے اس کی سرزمینِ بدایوں میں نظیر نہیں ملتی۔ آپ زبردست ادیبِ شہیر تھے۔ آپ نے قلم کے ذریعہ سے برطانوی سامراج کا مقابلہ کیا ہے۔"[4]

آخری عمر میں جب بدایوں پر انگریزوں نے حملہ کیا تو اس وقت آپ شمشیر بکف ہو کر میدانِ رزم گاہ میں صف آرا ہوئے اور اسی میدان میں جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ یہ واقعہ 17/رمضان المبارک کو پیش آیا۔

حضرت مولانا امام بخش بہاول پوری شہید:

آپ مولانا محمد حسین چنڑ کے ماموں زاد اور مولانا غلام رسول چنڑ بہاول پوری کے عم زاد تھے۔ جب فرماں روایانِ بہاول پور نے انگریزوں کی خوشہ چینی کی اور مجاہدینِ آزادی کو صفحۂ ہستی سے ختم کرنا چاہا تو آپ تن تنہا ان نوابوں کے خلاف ڈٹ گئے۔ آپ نے چند ایک خطوط لکھے جس میں نوابانِ بہاول پور کی برطانوی حاشیہ آرائی پر اظہارِ افسوس کیا اور برطانوی سامراج کے خلاف اقدام اٹھانے کو عین اسلام قرار دیا تو بہاول پور کے حکمرانوں نے آپ کی غیرت کو پسند نہ کیا بلکہ کسی سپاہی کو بھیج کر آپ کو شہید کرا دیا۔[5]

آپ کی شہادت 17/محرم الحرام 1267ھ کو ہوئی۔ آپ کا مزار شریف حضرت مولانا...... (باقی، ص:85 پر)......

جنگ آزادی کے سنی شعرا

اسد نظامی

1857ء کی جنگ آزادی میں جہاں علما و مشائخ نے فرنگی تسلط کے خلاف اپنی مخلصانہ کوششیں کی، وہیں پر شعرائے اہلِ سنت نے بھی عوام میں شعورِ آزادی کو ابھارنے میں نمایاں حصہ لیا، اس نتیجے میں ان شعرائے اہلِ سنت کو روزنِ دیوار میں چنوایا گیا، کسی کو تختۂ دار پر کھنچوایا گیا، کسی کو توپ اور بندوق کی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا، کسی کو محبوسِ زنداں کر دیا گیا۔ غرضے کہ اس ہول ناک دور میں کوئی سنی عالم، شیخ یا شاعر ایسا نہیں تھا جو برطانوی حکام اور افواج کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہا ہو۔ بر سبیل تذکرہ قارئین سے مختصر الفاظ میں ان شعرائے اہل سنت کا تعارف کرایا جا رہا ہے، جنھوں نے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر علم سنیت کو بلند رکھنے کی ہر ممکن جدو جہد کی۔

حضرت مولانا لیاقت علی الٰہ آبادی:

آپ علاقہ چائل ضلع الٰہ آباد کے باشندہ تھے۔ آپ علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فن شاعری میں حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمہ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس میں مشغول رہے، پھر جب حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی نے انگریزوں کے خلاف فتوائے جہاد دیا تو آپ نے بھی درس و تدریس کو خیر باد کہہ کر فرنگی تسلط کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔

"جب آپ نے اعلانِ جہاد فرمایا تو الٰہ آباد کی فوجی رجمنٹ نمبر 6 نے جس میں بیش تر حضرات مولانا صاحب کے مرید و معتقد تھے، اعلانِ جہاد سنتے ہی فوج سے باغی ہو کر برگشتگی اختیار کر لی اور تمام کے تمام حضرات مولانا کی خدمت میں بمع اسلحہ و ہتھیار حاضر ہو کر حضرت کو اپنا امیر کارواں بنا لیا۔"

جب برطانوی کپتان الیکو ینڈر پرچ نے فوج میں بغاوت دیکھی تو وہ کپتان راج گھاٹ کے قلعے میں قلعہ بند ہو گیا اور اپنے حامیوں سمیت قلعہ کے اندر سے گولہ باری شروع کر دی۔ مولانا اور آپ کے ساتھی قلعے کا محاصرہ کر کے اس میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے، جس میں رام چند توپچی اور کپتان الیکو ینڈر پرچ اور اتہس جیسے برطانوی افواج کے فوجی جرنیل مارے گئے۔

حضرت مولانا لیاقت علی کی مجاہدانہ قیادت نے قلعہ فتح ہونے کے بعد الٰہ آباد میں جہاں جہاں بھی برطانوی فوج کے ہیڈ کوارٹر تھے، ان سے مقابلہ کر کے سب کو جہنم واصل کر دیا۔ ڈاکٹر پرل کی کوٹھی، مسٹر لارڈ بیل کا ڈاک خانہ اور دیگر اہم مقامات کو ان مجاہدین نے تہس نہس کر دیا۔

حضرت مولانا نے بہادر شاہ ظفر کا علم برنگ سبز لے کر الٰہ آباد میں نصب کر دیا اور فرمانِ شریعتِ محمدیہ علیہ التحیۃ والثنا سنا کر شرعی قوانین کا اجرا کر دیا۔

6/جون 1858ء کو برطانوی پلٹن نے الٰہ آباد پر حملہ کر دیا، جس میں تمام مجاہدین شہید ہو گئے، مولانا کو زندہ گرفتار کر کے انڈمان بھیج دیا گیا۔

آپ ایک بہترین سپاہی کے علاوہ ایک لازوال شاعر بھی تھے۔ آپ کے دیوان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ نے رزمیہ اشعار اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔

جاتے کفن ہیں باندھ کے مقتل میں اے علی
ہم بھی پئیں گے جامِ شہادت بھرے ہوئے

مولانا رضی الدین خاں بدایونی شہید رحمۃ اللہ علیہ:

آپ علم و ادب میں حضرت مولانا امام بخش صہبائی شہید کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ آپ عربی فارسی کے ایک بہترین عالم و محقق تھے۔ حضرت مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی کے ساتھ مل کر برطانوی سامراج کے خلاف نواب بہادر خاں کی معیت میں بدایوں کی سرزمین پر ایک آزاد حکومت قائم کر دی، جس میں نواب بہادر خاں کو مجاہدینِ آزادی کا میر کارواں بنا کر برطانوی حکام کے خلاف اپنی جدو جہد شروع کر دی۔ آپ کے قافلے نے برطانوی افواج پر بے شمار

حملے کیے، جن میں لاتعداد برطانوی سپاہیوں کو کیفر کردار تک پہنچایا گیا:

''جب مولوی شاہ رضا علی بریلوی و مولوی امام بخش صہبائی کے رفیق مولانا رضی الدین بدایونی اور چند مٹھی بھر اشخاص نے انگریزوں کے خلاف مڈ بھیڑ کی تو آخر میں مولانا کو گرفتار کرلیا گیا۔''

جب مولانا صاحب کو انگریزوں نے گرفتار کرلیا تو انگریزوں میں کارمیکل نے آپ کو ہر چند کہا کہ آپ بغاوت میں حصہ لینے سے انکار کردیں تو ہم آپ کو رہا کردیں گے، مگر:

''جب کارمیکل کی بات سنی تو آپ نے گرج کر کہا کہ ہم آپ کو غاصب سمجھتے ہیں تو غاصب سے نجات پانا ہمارا اولین فریضہ ہے، ہم آخر دم تک آپ جیسے ظالم و جابر اور غاصبین کے خلاف ہر ممکن جہاد کریں گے۔''

بقول صاحب تاریخ بدایوں، کارمیکل نے آپ کو بغاوت کرنے کی پاداش میں بندوق کی گولی سے شہید کردیا:

''مولانا رضی الدین بدایونی بڑے مخلص مسلمان تھے، مذہبی علوم و معارف سے آپ بخوبی واقف تھے۔ حریت فکر و نظر کے ساتھ ساتھ فنونِ حرب و ضرب میں بھی آپ کو مہارتِ تام حاصل تھی۔ جہاد کو آپ فرضِ عین جان کر انگریزی حکام سے برسرِ پیکار رہے۔''

آپ نے میدانِ جہاد میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر میدانِ جہاد میں کود پڑے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

آپ ذوقِ شعر و سخن کے بھی بخوبی شناسا تھے۔ جب انگریزوں کے خلاف اپنا علمِ جہاد بلند کیا تو آپ نے رزمیہ اشعار کہے، جس سے عوام میں برطانویوں کے خلاف یک لخت لاوا ابلا اور عوام برطانوی افواج کے خلاف میدانِ جہاد میں ان غاصبین کو تہ تیغ کرکے فی النار کرتے رہے۔

زجرم پاداش از آزادیِ افرنگ
در قفس محبوس بودیم و چشم پر زآب
سختی و صعب، بیماری و افلاس
پناہ گاہیم حاشیۂ رسالت مآب

21/اپریل 1859ء کو آپ نے شہادت کا مقام حاصل کیا۔

مولانا مفتی صدر الدین آزردہ رحمۃ اللہ علیہ:

خطۂ دہلی کے اربابِ فکر و سخن و حلقۂ دانش کے شہنشاہ و نیر تاباں کہ جن کی علمی صلاحیت ایک مسلمہ حقیقت تھی، جن کا اعتراف غالب و مومن، نیر و تاباں جیسے لوگ کرتے تھے، آپ کی قابلیت کے بھی معترف نظر آتے ہیں۔ وہ بزم فکر و سخن تشنۂ تکمیل ہی نظر آتی جس بزم میں حضرت قبلہ مفتی صاحب شریک نہ ہوتے۔

آپ کے سامنے غالب و مومن اور شیفتہ جیسے شعرا بھی ہیچ نظر آتے ہیں۔ جب آپ اشعار بیان فرماتے تو دہلی کے شعرا و ادبا، فصحا و بلغا کہ جنھیں اپنی ادق علمی کا غرور ہوتا تھا، وہ حضرات ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتے اور آپ کی پُر عظمت شخصیت کے سامنے انگشت بدنداں ہوجاتے۔

جب مغلیہ خاندان کی حکومت سمٹ کر دلی کے لال قلعے تک محدود ہوگئی، برطانوی حکام تمام ملک پر اپنی عیاری کے بل بوتے پر محیط و مسلط ہوگئے تو بزم ہائے شعرا و مجالسِ فکر و سخن آہستہ آہستہ سونی ہوتی چلی گئیں۔ اربابِ شعر و فن کے قدرداں نہ رہے۔ بہادر شاہ ظفر کی حکومت کا طنطنہ آخری ہچکی لے کر عدمیت کے عالم میں ڈوب گیا۔

اندریں حالات بزم فکر و سخن کا انعقاد ناممکن ہوگیا۔ علمی و ادبی مجلسیں سونی ہوگئیں، امتداد زمانہ نے فقدان کا تلاطم برپا کردیا، احباب منتشر ہوگئے۔ حضرت قبلہ مفتی صاحب پر انگریزوں کی حمایت اور فتوائے جہاد پر دستخط کرنے کی پاداش میں ہر سمت سے ابتلا و آزمائش کے طوفانوں کے لاوے بہہ اٹھے۔ چناں چہ حضرت قبلہ مفتی صاحب خود ارشاد فرماتے ہیں۔

آفت اس شہر پہ قلعے کی بدولت آئی
واں کے اعمال سے دلی پہ بھی شامت آئی
روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی
گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

قبلہ مفتی صاحب اس دور کی ابن الوقتی اور طوائف الملوکی پر نوحہ کرتے ہوئے بڑے رنج و قلق کے ساتھ اظہارِ خیال فرماتے ہیں۔

غمِ بربادیِ دہلی میں بجائے مے ناب
خونِ دل پیتے ہیں اب بادہ کشانِ دہلی

زمزمے بھول گئے نغمہ طرازاں یکسر
ہے ہر اک نوحہ گر و مرثیہ خوانِ دہلی

مفتی صدر الدین خاں آزردہ دہلوی نے حضرت مولانا امام بخش صہبائی کی شہادت پر یہ شعر پڑھا۔

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

پھر ارشاد فرماتے ہیں۔

گو اسیری میں ہوں پر مثلِ اسیرِ تصویر
نہ غمِ قید نہ پروائے رہائی مجھ کو

بقول صاحب حدائق الحنفیہ:

''تمام جائدادیں و املاک جو بھی تیس سال کی ملازمت میں پیدا کی ہوئی تھی، سرکار میں ضبط ہوگئی، بلکہ جہاد کے فتویٰ کے اشتباہ میں چند ماہ نظر بند رہے۔''

برطانوی سامراج سے رزم و بزم میں مقابلہ کرنے میں آپ کا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔ بعض لوگ آپ کی شخصیت کو مجروح کرنے کی سازش کے پیشِ نظر آپ کے فتوائے جہاد کو مشکوک قرار دیتے ہیں، بالخیر کو بالجبر کا الزام لگا کر آپ پر انگریز پرستی کی تہمت لگانے میں مصروف نظر آتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ،

ع: کور چشمان باز رو خواہند

آپ کی عمر 81/سال کی تھی، آپ کا وصال شریف 24/ربیع الاول 1285ء میں بہ عارضہ فالج کے ہوا۔

مولانا امام بخش صہبائی شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ:

آپ کا مولد تھانیسر تھا، آپ حضرت مخدوم جلال الدین تھانیسری چشتی علیہ الرحمہ کی اولاد امجاد میں سے تھے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی مولانا محمد بخش تھانیسری علیہ الرحمہ تھا۔ آپ اردو، فارسی، عربی علم و ادب پر مکمل طور پر عبور رکھتے تھے۔ آپ کی علمی قابلیت ایک مسلمہ امر تھی۔ سر سید احمد خاں علی گڑھی نے آپ کی ذات گرامی کے متعلق ان الفاظ میں اپنے خیال کا اظہار کیا ہے:

''بریلوی مکتبِ فکر کے مشہور عالمِ دین مولانا امام بخش صاحب صہبائی جیسے محقق کا اگر ہم تذکرہ نہ کریں تو یہ سراسر بے انصافی ہوگی کہ جس نے دنیائے علوم و فنون میں اپنی عظمت و شرافت، علوم و معارف کا سکہ بٹھا دیا۔ یہ بات صرف معاصرین میں نہیں بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس ہندستان میں قیامت تک صہبائی جیسا شخص پیدا بھی نہ ہو۔''

حضرت علامہ صہبائی شہید کے متعلق یہ رائے صرف سر سید احمد خاں علی گڑھی کی نہیں بلکہ آپ کے تمام معاصرین، ادبا، فضلا، نقبا اور محققینِ علم و ادب بھی آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل کرنے کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے رہے۔ زوالِ خاندانِ مغلیہ اور برطانوی مسلطین کے بعد علمی و ادبی محافل روبہ زوال ہوگئیں، افراتفری و ابتری پھیلتی چلی گئی۔ چناں چہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی آپ کے متعلق رقم طراز ہیں:

''دہلی میں جتنے اہلِ کمال اس وقت جمع تھے ان میں فارسی دانی اور علم و بلاغت میں کوئی شخص صہبائی سے بڑھا ہوا نہ تھا۔ غالب، ذوق، آزردہ، منیر، شیفتہ، مومن، سب ادبائے عصر کو صہبائی کی فضیلتِ علمی کا اعتراف تھا۔''

علم و ادب کی محفلوں میں گو آج کل غالب کی علمیت کا چرچا ہے، مگر افسوس ہے کہ غالب کے مداحین غالب کا تذکرہ کرتے وقت حضرت علامہ صہبائی جیسی شخصیت کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں، حالاں کہ غالب جیسا شخص حضرت صہبائی کی علمی فقاہت کا نہ صرف معترف ہے بلکہ اپنے آپ کو ایک مقام پر شاگرد تصور کرتا ہے:

''میں حضرت علامہ امام بخش صاحب صہبائی کی عظمت و علمی فقاہت کا نہ صرف معترف ہوں بلکہ علوم و معارف میں علامہ کا شاگرد بھی ہوں۔''

غالب کے اعتراف سے بھی یہ بات مترشح ہے کہ علم و فضل میں علامہ صہبائی جیسا علم و فضل کا بحرِ زخار کم از کم آپ کے معاصرین میں تو نہ تھا۔

حضرت علامہ صہبائی کی شہادت: جب حضرت علامہ نے انگریزی سامراج کے خلاف اپنی جدو جہد کا آغاز کیا، اپنے علم و ادب کی روشنی میں شعورِ آزادی کا جذبہ ابھارنے کی مساعیِ جمیلہ شروع کی تو برطانویوں نے آپ کی آزادی کا نعرہ ناپسندیدہ قرار دیا اور آپ کو گرفتار کرکے مسجد میں شہید کردیا۔ بقول شیخ محمد اسماعیل پانی پتی:

''جب دہلی میں 1857ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو صہبائی

خانہ نشین ہوکر بیٹھ گئے، مگر زیادہ دیر تک کنج عزلت اور گوشۂ عافیت ان کو پناہ نہ دے سکا اور 20/دسمبر 1857ء کو پانچ ماہ کے محاصرہ کے بعد انگریزوں نے دہلی فتح کرلی جس کے بعد انگریزی فوج نے دہلی کے مظلوم اور بے کس باشندوں پر وہ ظلم توڑے جن کی انتہا نہیں۔

مولانا صہبائی ایک دن محلّہ کی مسجد میں نمازِ فجر ادا کر رہے تھے کہ گورے مسجد میں گھس آئے اور سارے نمازیوں کے ساتھ ان کو اور ان کے دو بیٹوں کو گرفتار کرکے لے گئے، چلتے چلتے محلّہ کے چودہ سو آدمی پکڑے اور سب کو جمنا کے کنارے گولی ماردی۔“

حضرت علامہ کی شاعری: جیسا کہ گزشتہ سطور میں یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ حضرت علامہ کی علمی قابلیت کے تمام معاصرین نہ صرف معترف تھے بلکہ بعض تو خود کو علامہ صہبائی کا شاگرد و تلمیذ قرار دینے میں فخر وانبساط محسوس کرتے تھے۔ حضرت علامہ کی رزمیہ شاعری کا صرف ایک شعر ہمیں مل سکا ہے۔

دامن سے ڈھاک جیسے کوئی لے چلے چراغ
جاتے ہیں سوزِ عشق لیے یوں کفن میں ہم

حضرت علامہ صہبائی کی شہادت پر حضرت علامہ مولانا شاہ رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ نے چند شعر کہے، وہ یہ ہیں۔

ندانم کجارفت ای نقش پاک — فلک بردیاماند بروے خاک
ندانم کسے دادا ورا کفن — دیاماند چوں سایہ برخاک تن
ندانم چہ کرداست باا وسپر — زجامہ کفن کردیا تاب مہر
نجا کش نمودند اورا نہاں — دیامہ تقع شد سوے آسماں
کسے فاتحہ ہم بروخواندہ است — بہ عطر گلابی برافشاندہ است

کدامے گل وبلبل وبادِ دشت
نجا کش بہ حسنِ عقیدت گزشت

مولانا اعجاز حسین سوز شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ:

حضرت مولانا اعجاز صاحب سوز شہید حضرت علامہ امام بخش صہبائی شہید علیہ الرحمہ کے خواہرزادہ تھے۔ آپ نے تعلیم وتربیت اپنے ماموں علامہ صہبائی کی زیرِ نگرانی حاصل کی۔ جب برطانوی حکام غداروں کی غداری اور سازشیوں کی سازشوں کی بدولت برصغیر پاک و ہند پر مسلط ہونے میں کامیاب ہوگئے تو وہ شخصیتیں جو برطانوی تسلط کے خلاف برسرِ پیکار رہیں اور انگریزوں نے منتقمانہ کارروائیاں شروع کردیں، تو انگریزی نوکِ تلوار سے کوئی بھی ایسا شخص محفوظ نہ رہ سکا جو انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہا ہو۔ جب مسجد میں حضرت صہبائی شہید صبح کی نماز ادا کررہے تھے تو انگریزوں نے حضرت علامہ صہبائی کے ساتھ آپ کے بھانجے کو بھی دریا کے ساحل پر لے جاکر شہید کرکے نعشیں دریا میں بہادیں۔

منشی محمد اسماعیل منیر شکوہ آبادی علیہ الرحمہ:

جناب منشی محمد اسماعیل منیر، ان شعراے مجاہدین میں سے تھے جنھوں نے دنیاے فرنگیت کے خلاف شعراے اہل سنت کو جمع کر کے فرنگی تسلط کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا۔ آپ حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی کے ممتاز تلامذہ اور حضرت مخدوم شاہ رضا علی مجاہدِ کبیر بریلوی علیہ الرحمہ کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ آپ کو برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کرنے میں گہرا شغف رہا۔

آپ کے جد اعلیٰ جناب سید بہاء الدین بلخی بہ زمانۂ سلطان علاء الدین غوری شکوہ آباد میں تشریف فرما ہوئے اور جناب سید صاحب کے پوتے کے پڑپوتے جناب سید شرف الدین علی خاں کو شکوہ آباد و فیروز آباد کی صوبہ داری، بہ جانب سلطان محمد شاہ عطا ہوئی۔

آپ کا ذوقِ شاعری: سرزمینِ شکوہ آباد سے آپ دہلی تشریف لے گئے۔ غالب، مومن، اسیر وریختہ کی محفلیں دیکھیں مگر آپ مطمئن نہ ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد جب حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمہ خیرآباد سے دہلی میں تشریف فرما ہوئے تو آپ نے مولانا کی شاگردی اختیار کرلی۔ اس کے بعد دہلی میں کوئی ایسی محفل شعرا و ادبا نہ تھی جس میں منیر صاحب کو شامل نہ کیا گیا ہو:

”منشی محمد اسماعیل صاحب منیر شکوہ آبادی مرحوم مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم کے ممتاز تلامذہ میں تھے۔ غالب، صہبائی، آزردہ، اشک بھی آپ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ فنِ شاعری میں آپ کا بہت بلند مقام تھا۔“

سنی طبقہ کے علما و مشائخ نے آپ کا بے حد احترام کیا۔ حضرت مخدوم شاہ احمد سعید مجددی، حضرت خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی چشتی نظامی، حضرت مولانا سید محمد قاسم شاہ داناپوری، حضرت مولانا غلام امام شہید، حضرت مولانا مفتی کفایت علی کافی مرادآبادی جیسی شخصیتوں نے بھی آپ کی خدمات کو بے حد سراہا۔ جب حکومت مغلیہ کا آفتاب سلطنت غروب ہوا تو جہاں شعراے اہلِ سنت نے برطانوی اسٹیٹ انڈیا کے خلاف متحدہ طور پر ایک زبردست محاذ بنایا، پورے برصغیر میں فرنگی تسلط کے خلاف لوگوں کے جمود خون میں ولولہ اور جرأت و ہمت پیدا کرنے کی ہر چند مساعیِ جمیلہ کیں وہیں پر حضرت منیر شکوہ آبادی کی خدماتِ جلیلہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

باندہ کی فتح پر منیر کا اظہارِ تحسین: شہر باندہ پر جون 1857ء کے آخری عشرے میں برطانوی افواج نے چند غداروں کی سازش سے قبضہ کرلیا جس میں بے شمار مجاہدین آزادی جامِ شہادت نوش کرگئے مگر بعض مجاہدین اس فرنگی بلوے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے، جس میں باندہ کے وزیراعظم جناب مرزا ولایت حسین خاں بھی شامل تھے۔ باندہ سے نکل کر شکوہ آباد پہنچے، رات کو جناب منیر کے یہاں قیام کیا۔ اس قیام کے دوران ایک فوجی دستہ تیار کیا، جس میں شکوہ آباد، فیروز آباد سے اسلحہ جمع کیا گیا۔ ان مجاہدین کو اسی موصولہ اسلحہ سے لیس کرکے راج گڑھ پر حملہ کردیا جس میں برطانوی بدحواس ہوکر مقابلہ کیے بغیر فرار ہوگئے، پھر اس کے بعد باندہ پر حملہ کردیا گیا تو باندہ بھی فتح ہوگیا، جس میں اسلامی بقا و استحکام کی خاطر ایک لائحۂ عمل مرتب کیا گیا۔ جناب منیر صاحب نے باندہ کی فتح پر یہ تاریخی قطعہ تحریر فرمایا۔

چو فوجِ بندیلہ بباندہ رسید
ز حصن اجے سنگھ برائے فساد
پریشانِ ظفر یافت نواب جا
دلِ اہلِ انصاف گردید شاد
چنیں گفت تاریخ نصرت منیر
خدا فتح عالی بہ نواب داد

منیر قیدِ افرنگ میں: برصغیر ہندو پاک پر بہ زور مکاری وسازش برطانویوں نے اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد ان مجاہدینِ آزادی میں سے کسی کو تختۂ دار پر کھنچوایا، کسی کو دریاے جمنا پر شہید کرکے ان کی نعشوں کو طغیانیوں کے سپرد کردیا، کسی کو سزا کے طور پر جزیرۂ انڈمان بھیج دیا، باقی ماندہ مجاہدین کا عرصۂ حیات کا قافیہ تنگ کر دیا، غرضے کہ کوئی شخص بھی ان کے نشانۂ جور واستبداد سے نہ بچ سکا۔ ان مجاہدین شعراے اہل سنت میں جناب منیر بھی تھے کہ جن پر برطانوی حکام نے بے تحاشا ظلم وستم کو روا رکھا، جن کا تذکرہ خود منشی صاحب اپنی کلیات منیر میں فرماتے ہیں اور آپ کو پاداش آزادی برصغیر ہندو پاک کے جزیرۂ انڈمان میں سزا کے طور پر بھیج دیا گیا۔ آپ کے استاذ مکرم مولانا فضل حق خیرآبادی بھی یہاں پہلے سے جیل کی قید و بند کاٹ رہے تھے، جب منشی صاحب نے حضرت مولانا صاحب کی یہ کیفیت دیکھی تو خون کے آنسو روتے ہوئے ارشاد فرماے ہیں۔

اشک زلیخا ہوا بحر صفت جوش زن
غرق ہوا نیل میں یوسفِ گل پیرہن
مخزنِ فضل و کمال، عالمِ عالی مقام
ناقدِ تازی زبان فیض شناسِ سخن
مولویِ بے نظیر، فضل حق اسمِ شریف
دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و مؤتمن

جناب منشی صاحب سے بھی مشقت کرائی گئی اور دریں اثنا مولانا فضل حق کا انتقال ہوگیا۔ جب یہ خبر منشی صاحب کو ہوئی تو انگریزوں کے خلاف اپنا اظہارِ رنج و قلم کرتے ہوئے بصد افسوس کہتے ہیں۔

قید میں میں اور وہ، رہتے تھے اک ہی جگہ
عین سمندر میں تھے غرقۂ بحرِ محن
نصف قصیدہ کیا، سامنے ان کے رقم
ختم ہوا جب، تھے وہ ہمدم گور و کفن

منیر شکوہ آبادی کی رہائی: جب آپ کی سزا کی مدت پوری ہوچکی تو پھر آپ کو وطن واپس بھیج دیا گیا۔ تاریخِ رہائی 28/محرم الحرام 1282ھ ہے۔

آپ کا وصال: آپ کی رحلت 1297ھ میں ہوئی اور رام پور کے قدیم گورستان میں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔

حضرت مولانا فضل احمد اسیر دہلوی علیہ الرحمہ:

آپ کو علمِ شاعری میں حضرت مخدوم مولانا مفتی سید کفایت علی کافی شہید سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آپ کو تمام معاصرین پر فوقیت حاصل تھی۔ جب تحریکِ آزادی کی ابتدا ہوئی تو آپ نے حسب الامر محترم استاذ کافی علیہ الرحمہ دہلی میں حافظ رحمت خاں روہیلہ، مولانا

فضل حق خیرآبادی اور دوسرے زعمائے اہل سنت کا ساتھ دیا۔

"جب میجر جنرل ہڈسن نے مرزا الٰہی بخش کی مخبری سے بہادر شاہ ظفر اور اس کے بیٹوں کو گرفتار کیا تو آپ کو بھی ان کے ساتھ پابند سلاسل کر لیا گیا، پھر دہلی سے باہر لے جا کر آپ کو گولیوں کی بوچھار سے شہید کر دیا گیا۔"

جناب میر حسین تسکینؔ دہلوی علیہ الرحمہ:

آپ کا خاندان حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین، نور بخش دہلوی چشتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دربارِ مقدس پر مجاوری کرتا چلا آ رہا تھا کہ 1857ء کا ہول ناک دور آ پہنچا۔ نتیجۃً آپ پر بھی بے حد اثر پڑا۔ آپ نے بالواسطہ اور بلاواسطہ حصہ لیا:

"جب مولانا فضل حق خیرآبادی کو گرفتار کر کے جزیرہ انڈمان بھیجنے کی سازش کی جا رہی تھی تو آپ کو اس سازش کا علم ہوا تو آپ دربار شریف سے اٹھ کر دہلی کے قید خانے کے دروازے پر آئے تو وہاں پر میجر جنرل ہڈسن موجود تھا، اس میجر پر آپ نے تلوار سے حملہ کر دیا، جس میں ہڈسن زخمی ہو گیا۔ بڑی مشکل سے آپ کو گرفتار کر لیا گیا، مگر اس کے باوجود بھی چھ برطانوی فوجی مارے گئے۔ ایک ہفتے کے بعد آپ کو جیل خانے ہی میں شہید کر دیا گیا۔

سن شہادت 1268ھ ہے۔"

حضرت محمد یعقوب علی آبادؔ چشتی شہید:

آپ دہلی کے کوچہ چیلان میں سکونت رکھتے تھے، جب غالب، شیفتہ، آزردہ، صہبائی کی محفلیں سجتیں تو خصوصی طور پر آپ کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ 1857ء کا ہول ناک دور شروع ہوا تو آپ کو بھی انگریزوں نے گرفتار کر کے شہر سے باہر کسی درخت پر لٹکا دیا۔ آپ ان مظالم کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ آپ علم و ادب کے شاہ کار تھے، آپ نے بھی برطانوی تسلط کے خلاف چند اشعار کہے ہیں۔

سید برہان الدین آثمؔی دہلوی شہید:

آپ حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی فرقتی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت علامہ بھی آپ کا بے حد احترام کرتے تھے، کیوں کہ آپ سید زادے تھے اور حضرت علامہ فاروقی النسب تھے۔ بقول صاحب تذکرہ شعرائے دہلی، آپ اپنے فنِ شعر میں قادر الکلام تھے، جیسا کہ مولف کتاب مذکور نے اعتراف کیا ہے۔

"آپ تمام شعرائے دہلی کے سرگروہ فن وسخن کے علاوہ تاریخ گوئی و شمشیر شناسی میں بے پناہ دستگاہ رکھتے تھے۔"

آپ برطانوی تسلط سے بے حد پریشان تھے جیسا کہ آپ نے برطانوی حکام کی چیرہ دستیوں کا تذکرہ اپنے اشعار میں کیا ہے۔

خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہیں جز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ، یہاں گل تھا

آپ کو حق گوئی کی پاداش میں میجر جنرل ہڈسن نے گولیوں کی بوچھار کر کے 17/اپریل 1858ء میں شہید کر دیا۔

رفیع الدین خاں رضوی لکھنوی، شہید، علیہ الرحمہ:

آپ مولانا امام بخش صہبائی شہید کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ آپ کا خاندان دہلی میں مدتوں سے آباد تھا۔ آپ نے علوم وفنون مراد آباد اور لکھنؤ سے حاصل کیے، بلند پایہ ادیب وشاعر تھے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت علی کافی کے ساتھ مل کر تحریکِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا، تحریکِ آزادی کے مجاہدین میں شامل ہو کر اپنی رزمیہ شاعری سے لوگوں میں حریت پسندی کے جذبات پیدا کرنے کی مساعیِ جمیلہ فرمائی، اسی کی پاداش میں آپ کو گرفتار کر کے دہلی سے لا کر مراد آباد کے چوک حسن خاں میں گولیوں کی بوچھار کر کے شہید کر دیا گیا۔ تاریخِ شہادت 25/اپریل 1858ء ہے۔

نا توانوں کے ستانے سے حذر کر ظالم
عرش بھی آہ سے مظلوم کی ہل جاتا ہے

مرزا محمد جان بیگ کشمیری علیہ الرحمہ:

آپ کا خاندان دشِ قبچاک سے کشمیر میں وارد ہوا۔ آپ نے کشمیر سے دہلی میں حضرت خواجہ میر درد دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا، پھر وہیں کشمیر جا کر انگریزوں کے خلاف تحریک شروع کی، نتیجۃً میجر جنرل ہڈسن نے آپ کو گرفتار کیا اور دریائے توی کے ساحل پر آپ کو شہید کر کے نعش کو ٹکڑے کر کے دریائے توی میں بہا دیا۔

21/اپریل 1859ء کو آپ کی شہادت ہوئی۔

عبداللہ خاں ہمدمؔ شہید علیہ الرحمہ:

آپ بریلی شریف کے باشندہ تھے آپ نے جملہ علوم و معارف حضرت مخدوم شاہ رضا علی بریلوی علیہ الرحمہ سے حاصل کیے۔ آپ کو حضرت مولانا غلام امام شہید علیہ الرحمہ سے شرف تلمذ حاصل تھا، جب تحریکِ آزادی شروع ہوئی تو آپ نے بھی مولانا پیر علی پٹنوی شہید کے ساتھ مل کر برطانوی افواج کے خلاف نفرت پھیلانے میں نمایاں حصہ لیا۔ آپ نے مجاہدین کی بے حد امداد کی مگر برطانوی دستوں کی مخبری کرنے کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے۔ قید و بند کی حالت میں یہ قطعہ لکھی۔

نو گرفتار ہوں، کچھ رسم مجھے یاد نہیں
اس لیے لب پہ مرے نالہ و فریاد نہیں
کس کو حالِ دلِ غم گیں میں سناؤں آخر
قیس صحرا میں نہیں، کوہ میں فرہاد نہیں

آپ کو فتح بریلی کے بعد شہید کر دیا گیا۔

تاریخِ شہادت 17/جون ہے، (سن معلوم نہ ہو سکا)۔

امیر احمد مینائی علیہ الرحمہ:

آپ علمِ شاعری اور فنِ ادب کے مشہور شاہ کار اور بالخصوص تحریکِ آزادی کے علم بردار تھے۔ آپ نے علم و ادب میں اپنا ایک بہترین مقام پیدا کیا۔ بیش تر محقق وشاعر و ادیب آپ کے کارناموں سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ لکھنؤ کے باشندہ تھے۔ فنِ شاعری میں آپ نے جناب امیر الدولہ منشی مظفر علی خاں کی شاگردی اختیار کی۔ عقائد سنیہ کے زبردست موید وموثق تھے۔ آپ کی خداداد قابلیت کا شہرہ بڑھا تو رام پور کے نواب کلب علی خاں نے بھی آپ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ آپ نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا۔ بعض لوگوں نے آپ کو خریدنا چاہا تو آپ نے انھیں صاف جواب دے دیا۔

"آپ بالواسطہ اور بلاواسطہ انگریزوں کے خلاف اپنی بھرپور جد و جہد کرتے رہے، جن کی پاداش میں آپ کو پابند سلاسل کر دیا گیا۔"

آپ نے جیل میں یہ دو شعر لکھے۔

اللہ رے انقلاب جہانِ پلید کا
خونِ حسین غازہ ہے اب روئے عید کا
مقتل سے کم نہیں ہے قلم داں مرا امیر
ہر کلک ہے گلوئے بریدہ شہید کا

آپ پر مختلف صعوبتوں کے پہاڑ ڈھائے گئے، بالآخر جب انگریزوں نے دیکھا کہ اب امیر مینائی میں تاب جور و ستم باقی نہیں رہی تو انھوں نے آپ کو رہا کر دیا۔

رہائی کے بعد بھی آپ کی صحت اچھی نہ رہی، بلکہ نقاہت و بیماری کا عالم روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ آپ کی وفات 1900ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔

مولانا شاہ رضا علی رضاؔ بریلوی علیہ الرحمہ:

بریلی شریف کی مشہور شخصیت کہ جو فرنگی تسلط کے خلاف بے سروسامانی کے باوجود بھی برسرِ پیکار رہا، جن کی کاوشیں اسلامی خدمات اور دینی ترویج کے لیے وقف رہیں، جن کی مجاہدانہ یلغار سے باطل بید لرزاں کی طرح کانپتا و ہانپتا رہا۔

آپ نہ صرف علوم و فنون کے معتبر عالمِ دین تھے بلکہ میدانِ غنچہ گاہ میں تلوار کے دھنی بھی تھے۔ جب بریلی شریف میں برطانوی سامراج کے تسلط کی غوغا آرائی ہوئی تو آپ نے بھی نہ صرف فتوائے جہاد کی تائید و توثیق فرمائی بلکہ آپ نے بریلی کی سنی مساجد میں برطانوی سامراج کے مذموم عزائم سے بھی خبردار کیا۔

"آپ کو علمِ ادب سے بھی بے حد شغف تھا آپ فنِ شاعری میں حضرت مولانا مفتی صدر الدین آزردہ کے شاگردوں میں سے تھے۔"

حضرت مولانا صاحب کا ذوقِ ادبی انتہائی عروج پر تھا۔ آپ نے ہزاروں کی تعداد میں ادبی و دینی اشعار بھی ارشاد فرمائے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ رضا علی صاحب مجاہد کبیر ایک اور مقام پر فارسی زبان کی رباعی ارشاد فرماتے ہیں۔

عجب افتاد بر ہندوستاں بود
تسلط فرنگیاں بر مسلماں بود
رضا چہ گو نہ رنج و قلق نیفتاد
قضائے مہربان ہا بر مسلماں بود

فرنگی تسلط کے خلاف آپ مسلسل اپنی جد و جہد کرتے رہے، آپ فنونِ حرب میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، آپ کا وصال شریف 2/جمادی الاولیٰ 1286ھ کو ہوا۔

آپ کی رحلت کے بعد آپ کے فرزندِ ارجمند حضرت مخدوم العلماوالصلحا مولانا شاہ نقی علی خاں اور آپ کے پوتے اعلیٰ حضرت مجدد مائۃ حاضرہ مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی قدست اسرارہم قابلِ ذکر ہیں۔

نورالدین محمد خاں انورؔ شہید علیہ الرحمہ:

آپ نواب بدرالاسلام خاں بہادر کے نبیرہ اور نواب والا جاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ علوم شاعری میں جناب مفتی صدرالدین آزردہ اور مصطفیٰ خاں شیفتہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ آپ کوپامئو کے باشندہ تھے، آپ نے برطانوی تسلط کے خلاف حصہ لیا جس کی پاداش میں آپ کے گھر پر گورا پلٹنوں نے رات کی تاریکی میں حملہ کر کے آپ کو شہید کردیا۔ آپ کا یہ شعر صاحبِ تذکرہ خیرآباد نے نقل کیا ہے۔

کہ رود برباد سوز ونالہ ہاے عندلیب
گل گریباں چاک آمد از ہوائے عندلیب

آپ کی تاریخِ شہادت 17/صفرالمظفر 1273ھ ہے۔ آپ کوکوپامئو کے گورستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

سید منور علی شہید علیہ الرحمہ (آشفتہ شاہ جہاں آبادی):

آپ علمِ شاعری میں مفتی صدرالدین آزردہ علیہ الرحمہ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ شاہ جہاں آباد دہلی کے باشندہ تھے۔ جب جنگ آزادی کا دور شروع ہوا تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہوگئے اور باقاعدگی کے ساتھ حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے مجاہدینِ اسلام کے ساتھ شریک ہو کر عوام کو برطانوی تسلط کے خلاف ابھارنے اور بے حد اکسانے پر اپنے آپ کو مامور کرلیا۔

"جب لارڈ ہیٹنگ کو آپ کے متعلق یہ خبر ملی کہ سید صاحب علماے حق اہل سنت و جماعت کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف سازش کرنے میں ملوث ہیں تو انگریزوں نے اپنا ایک مخبر بھیج کر آپ کو مسجد میں ہی جا کر شہید کردیا۔"

14/جمادی الاولیٰ 1247ھ میں آپ کی شہادت ہوئی۔

حافظ عبدالرحمٰن احسان دہلوی شہید:

آپ کو عہدِ طفلی ہی میں علم فنونِ شاعری سے بے حد ذوق تھا۔ اسی ذوق کے پیشِ نظر آپ حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تسکینِ تشنگی حاصل کرتے رہے۔

"مرزا ایزد بخش اور شاہ عالم ثانی سے بھی آپ کے گہرے تعلقات تھے، جب مرزا الٰہی بخش جیسے سازشی غداروں کی وجہ سے میجر جنرل ہڈسن دہلی میں داخل ہوا تو دہلی سرزمین پر سب سے پہلا جو اس جنرل ہڈسن کی بندوق کی گولی کا نشانہ بنا وہ حافظ عبدالرحمٰن احسان دہلوی علیہ الرحمہ تھا۔"

آپ کا یہ شعر جسے ایک مورخ نے نقل کیا ہے، وہ یہ ہے۔

یہ ستانے سے مرے تجھ کو ہے حاصل ظالم
تجھے موذی کہے خلقت، مجھے ایذا پہنچے

تاریخِ شہادت 21/ربیع الاول 1277ھ ہے۔

مولانا مفتی سید کفایت علی کافی شہید علیہ الرحمہ:

خطۂ مرادآباد سے حضرت مولانا مفتی سید کفایت علی کافی شہید جیسی شخصیت نے برطانوی استعمار کے خلاف مجاہدینِ آزادی کی حتی الامکان مدد کی۔ بہادر شاہ ظفر آپ کی علمی و حربی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے علاوہ جنرل بخت خاں اور دوسرے زعماے مجاہدین حضرات بھی برطانوی استعمار کے خلاف مفید مشورے اور تجاویز آپ سے حاصل کرتے۔

آپ کو برطانوی افواج نے تحریکِ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں مرادآباد سے 6/رمضان المبارک 1274ھ میں حسن پور سے گرفتار کیا اور 27/رمضان المبارک 1274ھ بروز جمعرات بہ وقت عصر روزہ کی حالت میں برسرِ عام تختۂ دار پر لٹکا دیا۔

جب آپ کو دار پر چڑھایا جا رہا تھا تو اس وقت آپ کی زبانِ مبارک پر یہ نعتیہ اشعار تھے۔

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا
بس رسول اللہ کا دینِ حسن رہ جائے گا
ہم صفیرو، باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اڑ جائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا۔

☆☆☆☆☆

علامہ فضل حق خیرآبادی کا فتواے جہاد

اور مجاہدانہ سرگرمیاں

مولانا محمد اختر کمال قادری

مجاہدِ اعظم، بطلِ حریت علامہ فضل حق بن مولانا فضل امام خیرآبادی کی عبقری شخصیت جنگ آزادی 1857ء کے عظیم رہ نماؤں اور اس کے نمایاں ہیروؤں میں شمار کی جاتی ہے۔ جنگ آزادی میں جوش وخروش اور اشتعال انگیزی علامہ ہی کے دم قدم سے ہوئی۔ علامہ کی شخصیت 1857ء کے مسلّم رہ نماے جنگ علماے اہلِ سنت میں ہے۔ مگر آج کچھ لوگوں نے تاریخی حقائق پر پردہ ڈالنے اور جنگ آزادی کے مسلّم رہ نماؤں کے خلاف فضا پیدا کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے۔ تاریخ کا یہ المیہ ہر دور میں رہا ہے کہ طاغوتی طاقتیں علماے ربانیین کی واقعی کوششوں اور ان کے حقیقی کارناموں کو تاریخ کے صفحات سے یکسر ختم کرنے میں کوشاں رہیں۔ ان سے بغض و عناد رکھنے والے متعصب تاریخ سازوں نے جھوٹی روایتیں اور من گڑھت واقعات سے ہمیشہ ان کے روشن وتاب ناک کردار کو آلودہ کیا ہے۔ اور جو ننگِ دین وملت اس کے اہل نہیں تھے اسے اس کا سب سے بڑا رکن رکین بنا کر پیش کیا جاتا ہے، ایجاد وتحسین کا سہرا ان کے گلے کی زینت بنتا ہے۔

مثال ایسی ہے اس دورِ خرد کے ہوش مندوں کی
نہ ہو دامن میں ذرہ اور صحرا نام ہو جائے

انھیں میں علامہ فضل حق خیرآبادی کی ذات والا صفات بھی ہے۔ اسلامی تاریخ کے دعوے داروں نے تاریخی حیثیت سے انھیں زیادہ گزند پہنچایا۔ بالخصوص وہابی، دیوبندی جماعت میں سید احمد راے بریلوی اور اسماعیل دہلوی کے سیرت نگاروں نے تو یہ التزام ہی اپنے لیے رکھا کہ جس طرح بھی ہو تاریخ کے صفحات میں علامہ کی شخصیت کو اجاگر نہ ہونے دیں گے، بلکہ فضل حق سے آزادی کی زمام چھیننی ہے، چناں چہ مولانا عبدالشاہد خاں شروانی لکھتے ہیں:

"شاہ اسماعیل دہلوی کی سوانح لکھنے والوں نے علامہ کے ساتھ بڑا ظلم روا رکھا، رنگ آمیزی اور بہتان طرازی سے بھی دریغ نہ کیا۔"[1]

مولانا مثال کے طور پر مرزا حیرت دہلوی صاحب حیاۃ طیبہ شاہ اسماعیل دہلوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مرزا حیرت دہلوی صاحب حیاۃ طیبہ نے تو محوِ حیرت ہی بنا دیا نہ صرف علامہ بلکہ ان کے والد ماجد مولانا فضل امام کو بھی پڑھا لکھا ماننے میں تامل کیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ انسان معاندانہ روش اختیار کرتے وقت نابینا کیوں ہو جاتا ہے۔"[2]

مرزا حیرت دہلوی اور ایسے ہی محمد جعفر تھانیسری کے متعلق اکثر کی راے یہی ہے کہ یہ دونوں پاے اعتبار سے ساقط ہیں۔ ان کی تاریخ گوئی اور روایت بیانی منظورِ نظر نہیں، بلکہ ہرزہ سرائی ہے[3] ان کی تصانیف اس شعر کی مصداق ہیں۔

تو لطفِ تماشہ لیتا جا مت ڈھونڈ سراغِ اصلیت
تصنیف کے صورت خانے میں کچھ وہم اور کچھ سچائی ہے

انھیں جیسے نام نہاد مورخین نے تاریخیں تصنیف کیں۔ جنگ آزادی کے مجاہدین اور شہدا کے خلاف کہانیاں گڑھیں اور انگریز کے جاسوس کو دین کا دشمن اور جنگ آزادی کا ہیرو ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اس کے لیے انھوں نے تاریخی ماخذ میں غلط بیانی سے کام لیا اور ان سے صرف نظر کر کے من گڑھت کہانیوں کی تشہیر کی اور کئی ننگ اسلام کو قدسی صفات بنا کر پیش کر دیا۔ لیکن مشہور ہے کہ...... "دروغ گورا حافظہ نباشد" ...... کسی نہ کسی پہلو سے کسی طرح منہ سے سچی بات کبھی نکل ہی آتی ہے، جیسا کہ آگے ملاحظہ کریں گے۔ علامہ کی ذات اور ان کے نمایاں کارناموں پر تاریخی حیثیت سے پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔

استاذ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور

مشاہدے کو تو کانٹوں کی بھیک بھی نہ ملی
سنا ہے صحنِ گلستاں میں پھول کھلتے ہیں

مشہور ادیب ونقاد نادم سیتاپوری لکھتے ہیں:

''مولانا فضل حق خیرآبادی گزشتہ صدی کا وہ بدنصیب کردار ہے جسے دشمنوں سے زیادہ دوستوں نے نقصان پہنچایا۔ انگریز اور ان کے ہوا خواہ مولانا سے اس لیے ناراض تھے کہ انقلاب سن ستاون کے سلسلہ میں کسی نہ کسی نہج سے ان کا نام آگیا ہے۔ لیکن خود مسلمانوں کا ایک ''پروپیگنڈسٹ گروپ'' مولانا سے اس لیے بے زار تھا کہ وہ ان کے مذہبی نظریات کے خلاف عالمانہ مجاہدہ کر چکے تھے۔ یہ باوقار علمی مباحث کوئی ذاتی اور عامیانہ جنگ نہیں تھے جس کا سہارا لے کر مولانا خیرآبادی کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر دیا جاتا، لیکن ہوا کچھ ایسا ہی۔ مولانا کے اکثر سیرت نگاروں نے نادانستہ نہیں دانستہ مولانا کی مدح سرائی اس انداز سے کی کہ خود ''مدح'' اور ''ہجو بلیغ'' سر بگریباں ہوگئے۔ چناں چہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج جب ریسرچ اور تحقیق کی نگاہیں تاریخ کے ان اوراق تک پہنچیں تو دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آئی۔''(4)

مزید لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ مولانا فضل حق (خیرآبادی) کے کئی سیرت نگاروں نے من گھڑت، جھوٹی اور بے سروپا حکایتیں بیان کر کے مولانا کے نیک کردار کو خواہ مخواہ سبک کرنے کی کوشش کی ہے۔''(5)

اس سلسلے میں علامہ فضل حق کے ایک سیرت نگار مفتی انتظام اللہ شہابی کے بارے میں نادم سیتاپوری لکھتے ہیں:

''جھوٹی روایات، من گھڑت واقعات اور فرضی کتابوں کے غلط حوالے مفتی صاحب کی ادبی زندگی کا شان دار شاہ کار رہا ہے۔''(6)

ان تاریخ سازوں میں کچھ تو جنگ آزادی کا ذکر کرتے ہوئے علامہ فضل حق خیرآبادی کا نام بھی لینا گوارا نہیں کرتے۔ کچھ تو یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے محض انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔ کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا اور کوئی قابلِ قدر خدمت انجام نہیں دی۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ فتویٰ تو انھوں نے دیا ہی نہیں اور فضل حق شاہ جہان پوری کے بجائے انھیں پکڑ کر کالا پانی کی سزا دی گئی تھی جہاں وہ شہید ہوگئے۔

مولانا امتیاز علی عرشی رام پوری اپنے مقالہ ''مولانا فضل حق خیرآبادی اور 1857ء کا فتوائے جہاد'' مطبوعہ ماہ نامہ تحریک دہلی، اگست 1957ء میں علامہ کے فتوائے جہاد کے منکر نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''مولانا نے علمائے زہاد اور ائمۂ اجتہاد کے فتویٰ دینے کا ذکر تو کیا ہے مگر اپنا حوالہ بالکل نہیں دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شریکِ فتویٰ بھی ہوتے تو جیسا کہ آگے چل کر اربابِ حکومت کو اپنے مشورے دینے کا تذکرہ فرماتے ہیں، یہاں بھی فتویٰ کی طرف کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور کرتے۔''(7)

ڈاکٹر مالک رام لکھتے ہیں:

''مولانا فضل حق مرحوم نے 1857ء کی تحریک میں واقعی حصہ نہیں لیا تھا۔ انھوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو تلقین بھی کی ہو لیکن جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً سب سے الگ تھلگ رہے، نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ عملی لحاظ سے، انھوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا اور نہ تلوار اٹھائی۔''(8)

یہ تھی تاریخ میں علامہ فضل حق خیرآبادی کی مظلوم شخصیت۔ آیئے بہ نظر صداقت و تحقیق علامہ کی فقید المثال، نابغۂ روزگار ہستی کے فتوائے جہاد اور ان کی روشن خدمات کا جائزہ لیا جائے۔ اربابِ علم و دانش کی نظر میں علامہ خیرآبادی کا کردار کتنا بلند ہے۔ انھوں نے کس گرم جوشی اور ملی درد کے ساتھ اس پہلی جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے۔ انشاء اللہ ہم اسے حقانیت کے آئینے میں پیش کریں گے۔

راجا غلام محمد نے نہایت بسط و تحقیق کے ساتھ اپنی کتاب ''امتیاز حق'' میں ان غلط پروپیگنڈوں کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ان لوگوں نے بہت چاہا کہ فضل حق خیرآبادی کی قربانیوں پر اپنی مصلحتوں اور مخالفتوں کے پردے ڈالیں مگر ان کے کردار کی پختگی، عزم کی سلامتی اور استقلال و ہمت کی جزئیات پر نظر ڈالیں تو یقین آتا ہے۔

آ کے گرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر(9)

کتبِ تواریخ میں علامہ کے فتوائے جہاد کا ذکر کس زور وشور سے ہے، آنے والی عبارتوں سے اس کا اندازہ کیجیے۔ میں صرف آپ کو علامہ کے فتویٰ کی بازگشت سناتا ہوں۔ خورشید مصطفیٰ رضوی ''جنگ آزادی 1857ء'' میں لکھتے ہیں:

''علما نے جس جس طرح بغاوت کو منظم کیا، اس کا مفصل بیان کرنے کے لیے تو ایک علاحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ مگر ان کا کچھ تذکرہ ان صفحات پر کیا جارہا ہے۔ اس حقیقت پر بڑے بڑے مورخ بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکے ہیں کہ یہ علما میں بے حد مقبول تھے۔ ان کی تحریر وتقریر کا بڑا اثر ہوتا تھا۔ چناں چہ دہلی میں جنرل بخت خاں کی تحریک پر مولانا فضل حق خیرآبادی اور دوسرے علما نے جو جہاد کا فتویٰ دیا، اس کے بارے میں مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے بھی اپنی تاریخ میں اقرار کیا ہے کہ اس سے مذہبی جوش وخروش بہت بڑھ گیا تھا۔''(10)

نیز اسی میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''کہا جاتا ہے کہ 1857ء قریب آنے پر آپ (فضل حق) نے اکثر والیانِ ریاست کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اگست 57ء میں دہلی آگئے اور یہاں جنرل بخت خاں کی تحریک پر جہاد کا فتویٰ مرتب کر کے پیش کیا، جس سے مسلمانوں میں بے حد جوش وخروش پیدا ہوگیا۔''(11)

علامہ کے فتوائے جہاد کے متعلق مجلّہ خیال لاہور کے سن ستاون نمبر میں شکور احسن صاحب مفتی صدر الدین آزردہ پر مضمون لکھتے ہوئے علامہ کے فتوائے جہاد کا ذکر کرتے ہیں:

جب برطانوی استعمار کے خلاف 1857ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو بعض شاعروں، ادیبوں اور عالموں نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا اور انگریزی حکومت کا اقتدار بحال ہوجانے کے بعد ان پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مولانا فضل حق کو جہاد کا فتویٰ صادر کرنے کے جرم میں انڈمان بھیج دیا گیا، صہبائی کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا، شیفتہ کو قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔''(12)

جب بھی کوئی مورخ تاثرات کو تعصبات سے قطع نظر کر کے 1857ء کا حال لکھے گا تو علامہ فضل حق خیرآبادی کے فتوائے جہاد کا ذکر ضرور کرے گا۔ آپ ہی نے جامع مسجد میں فتویٰ پڑھ کر سنایا، علما کے دستخط کروائے، اس فتوے کی اشاعت سے جدوجہدِ آزادی میں زور پیدا ہوا۔ بالآخر مقدمہ کے موقع پر علامہ فضلِ حق اس بات پر برقرار رہے کہ یہ فتویٰ انھوں نے لکھا ہے اور اب تک ان کی یہی رائے ہے:

''جب 1857ء کا ہنگامۂ عظیم دہلی میں رونما ہوا تو (مولانا فضل حق) فوراً دہلی پہنچے اور جہاد کا فتویٰ دیا۔ جنرل بخت خاں کمانڈر انچیف افواجِ ظفر سے ملے اور اس کی بڑی اعانت و امداد کی۔''(13)

سہ ماہی ''الزبیر'' بہاول پور کے تحریکِ آزادی نمبر 1970ء میں ہے:

''مولانا فضل حق نے ایک دن بعد نمازِ جمعہ جامع مسجد میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ پڑھ کر سنایا تو بہتوں کے لیے باعثِ تشویش بنا۔ اس فتویٰ پر مفتی صدر الدین آزردہ اور دوسرے پانچ علما کے دستخط تھے۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ جدوجہد نے ایک نیا زور پکڑا اور جگہ جگہ انگریزوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ تاریخ ذکاء اللہ کے بیان کے مطابق اس فتویٰ کے بعد صرف دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی۔''(14)

غیر مقلد مورخ غلام رسول مہر جو شاہ اسماعیل کے بڑے مداح ہیں۔ علامہ فضلِ حق خیرآبادی اور شاہ اسماعیل کے مابین ''مسئلۂ امتناع النظیر'' پر وقوع مناظرہ اور علامہ کا شاہ صاحب کو کافر قرار دینے کے سبب مورخ مذکور ہرگز علامہ کی شخصیت کو داد وتحسین کی نگاہ سے دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ تاریخ میں بے شمار ایسے لوگ گزرے ہیں جو تحریف فی التاریخ کے ناتے سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے بہت سے پاک باز نفوس قدسیہ کے روشن کردار کو مسخ کیا اور کئی ننگ اسلام شخصیتوں کو قدسی صفات بنا کر عرش بریں سے بھی اونچا کر دیا۔ مگر...... الحق یعلو ولا یُعلیٰ۔ حق کی تابانیوں سے عالم روشن ہوگیا۔ حق کسی نہ کسی طرح مورخین کے قلم سے صادر ہو کر

رہا۔ حتی کہ مہر صاحب بھی اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکے کہ فتویٰ کے سلسلے میں فضل حق کی کارکردگی سب سے زیادہ نمایاں ہے، اگر وہ نہ ہوتے تو اس فتویٰ کا وجود ہی نہ ہوتا۔

بات بن سکتی نہیں کوئی صداقت کے بغیر
تیر کی پشت پہ کردارِ کماں ہوتا ہے

مہر صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا (فضل حق خیر آبادی) کے دہلی پہنچنے سے پیش تر بھی لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کر رکھا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ آزادی پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا، جس پر علمائے دہلی کے دستخط لیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انھیں نے علما کے نام تجویز کیے جن کے دستخط لیے گئے۔''(15)

سعید احمد اکبر آبادی فاضل دیو بند علامہ کے فتوائے جہاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کتبِ تواریخ میں موجود فتوائے جہاد پر علامہ کے دستخط نظر نہ آئے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے انکار ہی کر دیا جائے۔ ہر گز نہیں بلکہ علامہ کا ایک مستقل فتویٰ تھا جس کا ذکر معتبر تاریخوں میں ملتا ہے:

''اس وقت ہمارے سامنے فتویٰ کی جو نقل ہے اس پر 38 دلی کے علما و مشائخ کے دستخط ہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے اس پر دستخط نہیں ہیں لیکن ان کا الگ مستقل فتوائے جہاد تھا جس کا ذکر 1857ء کی جنگ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔''

''مولانا بلند پایہ عالمِ دین ہونے کے ساتھ رئیسانہ طور طریق زندگی رکھتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی ایمانی جرأت و جسارت اور دینی حمیت و غیرت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دلی کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد جہاد کے واجب ہونے پر ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر کی اور اس کے بعد جہاد کے ایک اور فتویٰ کا اعلان ہوا، جس پر صدر الصدور مفتی صدر الدین خاں آزردہ، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر احمد خاں اکبر آبادی اور دوسرے علما کے دستخط تھے۔''(16)

علامہ کی زندگی اور ان کے کارہائے نمایاں کی تفصیلات کے ثقہ جامع مولانا عبد الشاہد خاں شروانی علی گڑھی مولف باغی ہندستان تاریخ مولوی ذکاء اللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورے کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا بعد نمازِ جمعہ جامع مسجد میں علما کے سامنے تقریر کی، استفتا پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کر دیے۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی، دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھیں۔''(17)

ان چند تاریخی شواہد سے آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو گیا کہ علامہ نے 1857ء کی جنگ آزادی میں وجوبِ جہاد کا فتویٰ دیا اور اس دور کے معاصر علما سے بھی استفتا کر کے وجوبِ جہاد کا فتویٰ لیا جس پر اس دور کی تاریخیں اور قلمی مخطوطات بھی شاہد عدل ہیں، جن کا انکار دن میں طلوعِ آفتاب کے انکار کے مترادف ہوگا۔ معکوسہ فتاویٰ میں علامہ کا دستخط نہ پا کر انکار کرنا ہر گز شیوۂ تحقیق نہیں۔ سعید احمد اکبر آبادی فاضل دیو بند کی حقیقت آشکار عبارت گزر چکی ہے۔ علامہ کی شخصیت پر تاریخی شکوک و شبہات وارد کرنے والوں کو یہ خبر نہیں کہ چاند پر تھوکنے سے اپنے ہی چہرے آلودہ ہوں گے۔ مولانا عبد الشاہد خاں شروانی نے اپنی کتاب ''باغی ہندوستان'' کے چوتھے ایڈیشن مطبوعہ ''المجمع الاسلامی مبارک پور'' میں بنام مقدمہ کی کارروائی ایک مستقل باب کا اضافہ کیا ہے۔ جس میں مقدمات کی مسل اور اس دور کے کچھ سرکاری کاغذات کی مدد سے نئے زاویۂ تحقیق کی روشنی میں تاریخی ماخذوں کی تغلیط کرنے والوں کے شکوک دور کر دیے ہیں اور اپنے معاصر و کرم فرما امتیاز علی عرشی رام پوری اور مالک رام پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے عدم طعن و تشنیع کی ارتجا بھی...... ''ایں گنا ہے است کہ در شہر شمانیز کنند'' اس کے بعد اخیر میں راقم ہیں:

''مقدمہ کی کارروائی معاصرین و مورخین کی شہادتیں اور انگریزوں کے بیانات کی روشنی میں محترم بزرگ

مولانا امتیاز علی خاں عرشی رام پوری اور جناب مالک رام صاحب کے نظریۂ مذکورہ پر نظر ڈالیں تو آپ کو صاف نظر آئے گا۔

حریف صافی و دردی نہ ایں خطا ایں جاست
نا خوش و خوش می کنی بلا ایں جاست

اور اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ۔

تفاوت ست میان شنیدن من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم (18)

پہلی جنگ آزادی میں بطل حریت علامہ فضل حق خیر آبادی کی نمایاں خدماتِ عالیہ سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ علامہ ہی کی جد و جہد سے اس میں اشتعال انگیزی، اسلامی جوش و خروش اور ملی جذبہ پیدا ہوا۔ آپ حکومت انگلشیہ کے ابتدائی ملازمت ہی سے اس کے متعصبانہ رویہ سے سخت متنفر ہو چکے تھے۔ جہاں کہیں بھی وہ ملکی عہدے پر فائز المرام رہے، ہمیشہ مسلمانوں میں ان کے دینی جذبے، ملی درد، اسلام کی روحانی طاقت و قوت اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی شان و شوکت کے ساتھ قومی عظمت باقی رکھنے کی کوشش کرتے، اور دل ہی دل میں ہندستانی قوم کے نوشتۂ تقدیر غلامی پر خون کے آنسو بہاتے۔ ہمارے جس عظیم رہ نما نے سب سے پہلے ہماری آزادی کے لیے اپنا خونِ جگر صرف کیا، ترغیبِ جہاد اور فکری رہ نمائی کے ذریعہ پوری قوم میں آزادی کی روح پھونکی اور قوم پر اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو قربان کرتے ہوئے ملک بدر ہو کر دیارِ غیر میں شدید مصائب و آلام اور لرزہ بر اندام تکلیفوں کو جھیلتا ہوا شوقِ شہادت پورا کر گیا۔ افسوس کہ اس قائد اعظم کی مجاہدانہ ریاضتوں اور مشقتوں کو بعض تاریخ کے صفحات پر قطع و برید کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ چناں چہ مالک رام کا نظریہ گزر چکا کہ وہ علامہ کے فتوائے جہاد اور مجاہدانہ سرگرمیوں کے منکر ہیں۔ غیر مقلد مورخ غلام رسول مہر اگر چہ کسی نہ کسی طرح فتویٰ کی تائید کر گئے، مگر وہ بھی علامہ کے مجاہدانہ کارناموں کا انکار کرتے ہیں:

''غالباً یہی وہ فتویٰ تھا جو انجام کار مولانا (فضل حق) کے خلاف مقدمے کا باعث بنا ورنہ انھوں نے نہ کسی جنگ میں حصہ لیا، نہ ان کے پاس کوئی عہدہ تھا، نہ کسی کے قتل میں شرکت کی اور نہ ان کے خلاف کوئی اور سنگین الزام تھا۔''(19)

تاریخ میں اسی منافقانہ چال اور معاندانہ رویہ اختیار کرنے کے سبب رئیس احمد جعفری اپنی تاریخ ''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد'' میں چہرۂ حقیقت سے نقاب کشائی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ غدر 1857ء کی روح رواں اور محرک اعظم صرف دو شخصیتیں ہیں جن میں دوسرے علامہ موصوف ہیں۔

''ہم نے غدر کے جن ہیروؤں کا ذکر کیا ہے ان میں سے صرف بخت خاں اور مولانا فضل حق خیر آبادی دو ایسی شخصیتیں ہیں جنھوں نے دہلی کے محاربات غدر میں مرکز نشین ہو کر حصہ لیا ہے۔ بخت خاں اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے احوال و سوانح، واقعات و حوادث، کارناموں اور سرگرمیوں کی تفاصیل معلوم کرنا آسان نہ تھا...... غدر کے بعد غدر کا ذکر بھی کتنا روح فرسا تھا۔ اور ان شخصیتوں کا تذکرہ جنھوں نے اس انقلابی تحریک میں مردانہ وار حصہ لیا تھا، اپنی جان سے ہاتھ دھونا تھا...... ان اکابر کا اول تو مرتب و منضبط صورت میں کہیں ذکر نہیں ملتا اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو مخالفانہ اور معاندانہ انداز میں۔ ان مشکلات کے باوجود زیادہ سے زیادہ معتبر اور مستند مواد حاصل کرنے کی اپنے مقدور بھر ہم نے کوشش کی ہے۔''(20)

روایت و تواریخ کے پیشِ نظر علامہ کی ملی و سیاسی خدمات کا جائزہ لینے سے قبل درایتی فکر و نظر کی روشنی میں اس وقت کے سیاسی و ملکی حالات کو سامنے رکھ کر سنجیدگی کے ساتھ شعورِ انسانی کو دعوتِ فکر دیں کہ آیا علامہ جیسا صاحبِ فکر و نظر صائب الرائے، دور اندیش شخص حیاتِ آزادی کے لیے کی جانے والی جد و جہد کے وقت خاموش تماشائی بنا رہ سکتا ہے، یا بے خطر اس آتشِ آزادی میں کود پڑتا ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد مغل شہزادوں کے درمیان اختلاف و انتشار کے سبب زوال کے اثرات رونما ہو چکے تھے۔ ادھر ہندستان کے جنوب مشرقی ساحل پر انگریزی قومیں بہ غرضِ تجارت یورپ سے ہندستان آ کر یہاں حکمرانی کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ حکومت کم زور، اور بیرونی طاقت زور پکڑتی رہی۔ بالآخر غدر سے پہلے ہندستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کس

قدر روح فرسا ہے، قارئینِ تاریخ ہند سے یہ بات مخفی نہیں۔ غیر ملکی پورے طور پر بیدار ہو کر مسلمانوں کی فطری صلاحیتوں اور ان کے جوش و جذبے کو اپنی حسنِ تدبیر سے یکسر منجمد کر رہے تھے۔ ان کے حکمرانوں کی غفلت ولاپروائی اور نا اہل عہدے داروں کی عیاشیوں اور عاقبت نا اندیشوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے اردگرد سازشوں کا جال بچھا دیا۔ ہمیشہ تاریخ کے اوراق کچھ غداروں کے شرم ناک کرتوت سے سیاہ رہے۔ ایک منظم طاقت کسی غدار کے مکرو فریب اور اس کی دغابازیوں کے سامنے ہیچ ہے۔ آنے والی سفید رو قوم نے اس میدان میں اپنی خصوصی توجہ مبذول کی۔ اسے یقین تھا کہ کبھی بھی صرف میدانِ جنگ میں قومِ مسلم کو مغلوب نہیں کیا جا سکتا۔ بالآخر اس نے ہماری ہی قوم میں چند ننگِ دین وملت پیدا کر کے ان کے ذریعہ اپنے قدم جمانے شروع کیے، پھر تو مختلف اضلاع وصوبہ جات پر ان کا تسلط ہوتا گیا۔

علامہ کی پیدائش کے دوسرے سال 1799ء میں سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد ملک کے اکثر حصہ پر انگریز قابض ہو چکے تھے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اختتام کے بعد غیر ملکی طاقت پورے ہند پر چھا گئی۔ ہندی قوم کے عروج کا ستارہ غروب ہو کر غلامی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ مغلوں کی بادشاہت صرف قلعہ کی چہار دیواری کے اندر محدود تھی۔ شاطر وعیار دشمن اب ہندستانیوں کے مذہبی امور میں مداخلت کر رہا تھا۔ لیکن ہر دور میں فرعونی طاقت کی سرکوبی کے لیے ایک موسیٰ کا وجود قانونِ فطرت ہے۔ اس وقت بھی اجلۂ علمائے کرام، محدثینِ عظام اور صوفیا ومشائخ کی ایک جماعت موجود تھی، جن کے سینے اسلامی علوم وافکار سے مملو تھے۔

دینی تعلیم میں حکومت کی لاپروائی کے سبب علما کی اکثریت سیاسیات سے یک گونہ الگ ہو کر تجدید دین واحیائے سنت میں مشغول تھی۔ یہ مقدس جماعت اپنے مقدور بھر مسلمانوں کے قلوب میں انسانی حریت اور اسلامی جذبے ودیعت کرتی رہی۔ علامہ فضل حق خیرآبادی اپنے زمانے کے فضلا وعلما میں سرخیلِ جماعت کی حیثیت رکھتے تھے۔ علامہ کا خاندان دینی عظمت کے ساتھ ساتھ دنیاوی وجاہت بھی رکھتا تھا، اس لیے آپ مختلف جگہ ملکی اعلیٰ مناصب پر فائز ہوتے رہے اور اس اسلام دشمن طاقت کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا، جس سے ان کے سینے میں مسلسل حریت وآزادی کی چنگاری مشتعل ہوتی رہی۔ اس لیے علامہ جہاں کہیں بھی رہے حتی الامکان ہندی قوم میں آزادی کی لہر پھونکتے رہے۔

بالآخر غلامی جب اپنی انتہا کو پہنچ گئی، ظلم کے ترکش کا آخری تیر مذہبی معاملات میں دخیل ہونے لگا اور منہ سے توڑی جانے والے کارتوس میں سور اور گائے کی چربی کی آمیزش کی گئی۔ جس سے ہندی فوج یک لخت مشتعل ہو کر انگریزوں کے خلاف محاذ آرا ہو گئی۔ (جس کی پوری تفصیل علامہ کی کتاب الثورۃ الہندیہ میں ملاحظہ کریں)۔

علامہ فضل حق جیسا دردمند حساس اور دانش مند مفکر جو اپنی عمر عزیز کے ایک بڑے حصے میں ان کی اسلام دشمنی کے سبب خون کے تلخ گھونٹ پی چکا ہو بھلا ایسے زریں موقع پر کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ فوراً علامہ نے اپنا فتوائے جہاد جاری کیا، پھر محض فتویٰ دے کر عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھنا کیسے متصور ہو سکتا ہے، یقیناً علامہ نے اس جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ مسلم ہے کہ میدانِ جنگ میں لڑنے والی فوج وہ کام نہیں کر سکتی جو ایک دانش ور قائد کی قیادت ورہ نمائی کر سکتی ہے۔ ایامِ بغاوت میں امورِ حرب وضرب اور مملکتی نظام میں اعیانِ سلطنت کو علامہ کا مشورہ دینا اور ان کی رہ نمائی کرنا، بادشاہِ وقت کو فوجیوں کی بھرپور مدد اور بہ وقت ضرورت ان کی عملی قیادت پر برانگیختہ کرنا مخفی امر نہیں۔[21] خود علامہ کو دہلی مدعو کیا جانا بھی اس پر بین ثبوت ہے۔ وہ الثورۃ الہندیہ میں لکھتے ہیں:

"توجهت تلقاء دهلی مما کان محلی، فالقیت بها رحلی ولا قیت بها اهلی واشرت الی الناس بما اقتضیٰ رائی و قضی به عقلی فلم یأتمروا بما اشرت ولم یأتمروا بما امرت."[22]

میں نے دہلی کا رخ کیا، وہاں پہنچ کر اہل وعیال سے ملا، اپنی عقل وفہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا، لیکن نہ انھوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور نہ میری بات مانی۔

روایتی پہلو سے علامہ خیرآبادی کی سرگرمیاں ملاحظہ ہوں۔ اس دور کے روزنامچوں اور تاریخوں میں پوری تفصیل تو مذکور نہیں، پھر بھی بہت سی سرگرمیوں کا سراغ ضرور ملتا ہے۔ علامہ بغاوت شروع ہوتے ہی دلی آگئے، وہاں اعیانِ سلطنت

کی رہ نمائی اور حکومت کے دستور العمل کی ترتیب شروع کر دی۔ اس کے بعد ہی آپ نے اپنا فتوائے جہاد صادر کیا۔ انگلش حکومت کے مخبرین کی بعض تحریریں ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ چناں چہ ایک جاسوس تراب علی لکھتا ہے:

"مولوی فضل حق جب سے الور سے آئے ہیں وہ فوجیوں اور شہریوں کو برطانیہ کے خلاف بھڑکانے میں مصروف ہیں۔"

"مولوی فضل حق کی اشتعال انگیزیوں سے متاثر ہو کر شہزادے بھی میدان میں نکل آئے ہیں اور سبزی منڈی کے پھل والے محاذ پر صف آرا ہیں۔"

ایک دوسرے مخبر چنی لال نے خبر دی:

"مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔"

دوسری فائل میں بھی کچھ اطلاعیں درج ہیں:

"مولوی صاحب (فضل حق) جب بھی بادشاہ سے ملتے وہ بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جنگ کے سلسلہ میں رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ باہر نکلیں اور دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں۔"

ایک مجلسِ مشاورت قائم کی گئی تھی۔ علامہ جس کے ایک نہایت فعال متحرک رکن بھی تھے:

"بادشاہ نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضلِ حق پر مشتمل ورکنگ کونسل بنائی۔"[23]

مغلیہ حکومت کی طرف سے علامہ کو بڑے بڑے اختیارات بھی حاصل تھے جن پر مختلف احکام کے نفاذ کی تفصیل مخبرین کے اپنے اپنے روزنامچوں میں مرقوم ہے۔ برطانیہ حکومت کے ایک جاسوس منشی جیون لال کے روزنامچہ میں وسط اگست 1857ء اور اوائل ستمبر میں علامہ کی کارکردگیوں کا ذکر موجود ہے۔[24]

اسی جیون لال کے ایک بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ نے شاہی فوج کی کمان بھی کی ہے، تراب علی کی مذکورہ رپورٹ بھی اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔[25]

روزنامچوں کی ان تفصیلات سے علامہ کے سیاسی حالات سے باخبری اور انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

پھر سقوطِ دہلی کے پانچ روز بعد علامہ خانماں بربادوں کی طرح اپنی متاعِ عزیز کتب خانہ اور دیگر ساز وسامان دشمن کے رحم وکرم پر چھوڑ کر خیرآباد کوچ کر گئے۔ خرابیِ دہلی کے بعد جنگ آزادی کی سرگرمیوں کا مرکز ملکہ حضرت محلؒ زوجہ نواب واجد علی شاہ رئیس اودھ، بنی۔ علامہ بھی چند دن بعد ملکہ کی معاونت کے لیے اودھ پہنچ گئے۔ وہاں حسب منزلت علامہ کو اعلیٰ عہدے پر فائز کیا گیا، اس کی مجلسِ مشاورت کے ایک اہم اور ممتاز رکن رہے اور انھیں مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ مگر ناکامی ونامرادی اور ہزیمت مقدر ہو چکی تھی۔ بالآخر اودھ اور اس کے اردگرد کے تمام علاقے انگریزوں کے زیرِ نگیں آگئے۔ پھر کچھ دنوں بعد علامہ گرفتار کر لیے جاتے ہیں جہاں سے ان کی ابتلا وآزمائش کا سنگین دور شروع ہوتا ہے۔[26]

یہ تھی دہلی اور اودھ میں علامہ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی ایک جھلک۔ اس کے علاوہ مقدمات کے بیان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ علامہ نے پورے طور پر جنگ آزادی میں فداکارانہ حصہ لیا اور اس کے زبردست محرک بھی رہے، ورنہ بہت سے علما کی شرکت اور بوقت جنگ آزادی بقیدِ حیات ہونے کے باوجود اتنی بھیانک سزا صرف علامہ ہی کے لیے کیوں منتخب کی گئی، یہ امر بھی تو ایک جداگانہ دعوتِ فکر اور لمحۂ نظریہ ہے۔ مختصراً مقدمات کی رپورٹ نذر قارئین ہے:

1- اودھ کے چیف کمشنر کا سکریٹری اپنے سرکاری مراسلے میں لکھتا ہے:

"مندرجہ ذیل لوگوں کے چلے جانے کے بعد حکومت کو قیامِ امن میں کافی سہولت ہو رہی ہے، فیروز شاہ، لکڑ شاہ، مولوی فضل حق جو ہماری حکومت کا دشمنِ جان ہے، حالاں کہ حکومت نے اسے اور اس کے اعزہ کو اعلیٰ مناصب عطا کیے تھے۔"[27]

2- مسٹر جارج کیمبل جوڈیشنل کمشنر اودھ ومیجر بارو قائم مقام کمشنر خیرآباد نے 4/مارچ 1859ء کو فیصلہ صادر کرتے وقت لکھا:

"بغاوت شروع ہونے سے قبل وہ الور میں ملازم تھا، یہاں سے دیدہ ودانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بہ قدم چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے اور اُسے خاص طور پر ہندستان سے جلاوطن کر دینا چاہیے۔"[28]

علامہ کے جہادِ آزادی میں شریک ہونے کی معاصر شہادتیں آپ نے ملاحظہ کرلیں۔ بعد کی تاریخوں میں بھی اس کا چرچا سنیے۔ مولانا حسین احمد مدنی جنگ آزادی میں علامہ فضل حق اور بعض معاصر علما اور ان کے تلامذہ کے بڑے پیمانے پر شریک کار ہونے کی شہادت دیتے ہیں:

''بہر حال مسلمان علما میں سے مولانا احمد اللہ شاہ صاحب، دلاور جنگ مدراسی اور مولانا فضلِ حق خیر آبادی اور مولانا امام بخش صہبائی......اور ان حضرات کے تلامذہ وغیرہ نے جہادِ حریت 1857ء میں بڑے پیمانے پر حصہ لیا تھا۔''(29)

محمد اسماعیل پانی پتی جنگ آزادی میں علامہ کی سیاسی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''(علامہ فضل حق نے) 1857ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کے خلاف سخت حصہ لیا جس کے نتیجے میں گرفتار کر کے کالے پانی بھیج دیے گئے، جہاں اس فاضلِ اجل، عالمِ بے بدل نے نہایت کس مپرسی، بے بسی اور لاچاری کی حالت میں 20/ اگست 1861ء کو انتقال کیا اور علم و دانش اور فضل و ہنر کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔''(30)

دوسری جگہ اپنے مضمون ''1857ء میں علماے کرام کا حصہ'' میں رقم طراز ہیں:

''جب 1857ء کا ہنگامۂ عظیم دہلی میں رونما ہوا تو علامہ فوراً دہلی پہنچے اور جہاد کا فتویٰ دیا۔ جنرل بخت خاں کمانڈر انچیف افواجِ ظفر سے ملے اور اس کی بڑی اعانت کی۔''(31)

مولوی رحمان علی ''تذکرہ علماے ہند'' میں لکھتے ہیں:

''جنگ آزادی 1857ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔''(32)

سوویت یونین کی سائنس اکیڈمی کے ادارۂ علومِ شرقیہ کی ایک ممتاز رکن ''مادام پولونکایا'' اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

''مولانا (فضل حق) اودھ تشریف لائے جہاں انھوں نے انگریزوں کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پرچار کیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ زمیں دار جو برطانوی حکومت سے مطمئن نہیں ہیں اس کی بنیادی طاقت ہوں گے۔ مولانا موصوف کے معاصرین اور ان کے سوانح نگاروں نے ان کے بہت سے خطوط کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کو لکھے تھے۔ انھوں نے برطانیہ کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پیغام دیا تھا۔ بغاوت کے زمانے میں مولانا انگریزوں کے مخالفوں کی صف میں رہے۔''(33)

پاکستان کے مشہور پروفیسر محمد ایوب قادری علامہ کے دہلی اور اودھ دونوں جگہ کے جہاد میں شریک ہونے اور اس پر جلا وطنی کی سزا پانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جنگ آزادی 1857ء میں مولانا فضل حق نے حصہ لیا، دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے، لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے، آخر میں گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا اور حبس دوام عبور بہ دریاے شور کی سزا ہوئی۔''(34)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''1857ء کے ایک ہنگامے میں مولانا فضل حق اودھ سے دہلی پہنچے اور دہلی سے بعد از خرابیِ بسیار اودھ پہنچے، حضرت محل کی کورٹ کے ممبر ہوئے، بعد ازاں مولانا فضل حق گرفتار ہوئے، بغاوت کے الزام میں اس یگانۂ روزگار شخصیت پر مقدمہ چلا۔''(35)

نام ور مورخ رئیس احمد جعفری اپنی تاریخ ''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد'' میں جنگ آزادی میں علامہ کی زبردست قائدانہ شرکت اور بہادر شاہ ظفر کے معتمدِ خاص اور مملکتی معاملات میں دخیل ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ (علامہ فضل حق خیر آبادی) انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور انگریزوں کو نکالنے کے لیے ہر منظم اور باقاعدہ تحریک میں حصہ لینے پر دل و جان سے آمادہ رہتے تھے۔ چناں چہ جب غدر شروع ہوا تو مولانا بے تامل شریک ہوئے۔ وہ بہادر شاہ کے معتمد، مقرب اور مشیر تھے، ان کے دربار میں شریک ہوا کرتے تھے، انھیں اہم معاملات و مسائل پر مشورہ دیتے تھے اور اس بات کے مساعی تھے کہ آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہو اور انگریز اس دیش سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائیں۔ مولانا نے غدر میں دلیری اور جرأت کے ساتھ علانیہ حصہ لیا۔''(36)

وہ منفعل ہو کہ مشتعل بلا سے مگر
کبھی تو حالِ دلِ زار برملا کہیے

مذکورہ تفصیلات غدر اور بعد کے تاریخی شواہد سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ بطلِ حریت علامہ فضل حق خیر آبادی شہید جزیرۂ انڈمان قومِ ہند کی آزادی کی خاطر ہمیشہ کوشاں رہے، یقیناً علامہ جیسی بیدار مغز، حساس دل اور حریت نژاد طبع عظیم عبقری شخصیت کا ضمیر یہ ہرگز گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ گلے میں کسی کی غلامی کا پٹکا بالخصوص اس قوم کی بے جا تختی کیسے قابلِ برداشت ہوسکتی ہے جو قوم اللہ و رسول کی دشمن اور اس کے لائے ہوئے آسمانی مذہب کی نیستی کی خواہاں اور رسول اللہ کے جاں نثاروں کے خون کی پیاسی ہو۔ اس شیرِ حق کی رگوں میں اپنے زندہ دل غیور اسلاف کا خون رواں تھا، وہ منجمد کیوں کر ہونے لگتا۔ افسوس کہ اس مردِ حق گو کے ساتھ اہل ہوا و ہوس متعصب مزاج تاریخ سازوں نے بڑا ظلم کیا، جو ان مورخین کی سیاہ دامنی اور بد کرداری کا سبب بن کر ان کی ذات کو داغ دار اور رسواے زمانہ تو کر گئی مگر علامہ کی مفرد و یگانہ روزگار ہستی پر کوئی حرف نہیں لا سکی۔

حوالے و حواشی

(1) مقدمہ باغی ہندوستان، ص:20
(2) باغی ہندوستان، ص:194
(3) دیکھیے مضمون ''اغلاط کی تصحیح'' از سید حکیم محمود احمد برکاتی، مشمولہ باغی ہندوستان، ص:294
(4) بہ حوالہ باغی ہندوستان، ص:417 غالب نام آورم
(5) بہ حوالہ امتیازِ حق، ص:12، غالب نام آورم، ص:109
(6) ایضاً، ص:13
(7) تحریک، دہلی اگست 1957ء بہ حوالہ باغی ہندوستان، ص:419
(8) تحریک، دہلی جون 1903ء بہ حوالہ فضل حق خیر آبادی اور ستاون عیسوی، ص:79
(9) امتیازِ حق، ص:26
(10) امتیازِ حق، ص:23 و باغی ہندوستان، ص:272
(11) ایضاً، ص:28
(12) ایضاً، ص:24 و باغی ہندوستان ص:272
(13) ایضاً، ص:25 و باغی ہندوستان، ص:272
(14) امتیازِ حق، ص:26 و باغی ہندوستان، ص:273
(15) ایضاً، ص:24
(16) بہ حوالہ مقدمہ تحقیق الفتویٰ، ص:17
(17) ایضاً، ص:215 (18) ایضاً، ص:278
(19) امتیازِ حق، ص:35 (20) بہ حوالہ امتیازِ حق، ص:40
(21) تفصیل کے لیے دیکھیے، ''الثورة الہندیہ مشمولہ باغی ہندوستان'' اور ''فضلِ حق خیر آبادی اور 57ء''
(22) باغی ہندوستان، ص:46
(23) ساری تفصیل باغی ہندوستان، ص:68-267 سے منقول ہے۔
(24) ایضاً
(25) فضل حق اور 57ء، ص:51 و امتیازِ حق، ص:50
(26) فضل حق اور 57ء، ص:62-61 و العلامۃ فضل حق
(27) باغی ہندوستان، ص:415
(28) ایضاً، ص:416 (29-30) ایضاً، ص:271
(31) ایضاً، ص:272
(32) ایضاً، ص:277 و امتیازِ حق، ص:42
(33) امتیازِ حق، ص:49
(34) باغی ہندوستان، ص:275 و امتیازِ حق
(35) ایضاً، ص:276 (36) ایضاً، ص:76-275

نوٹ:- علامہ فضل حق خیر آبادی کے فتواے جہاد اور ان کے مجاہدانہ کارناموں سے متعلق جو تاریخی شہادتیں پیش کی گئی ہیں، چوں کہ ہمیں اصل ماخذ دستیاب نہیں اس لیے یہ تمام تاریخی بیانات ''امتیازِ حق'' اور ''باغی ہندوستان'' بہ اضافہ مطبوعہ 88ء سے نقل کیے گئے ہیں۔ ہم نے کہیں ایک حوالہ درج کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ (قادری)

☆☆☆☆☆

شہیدِ جنگ آزادی

حضرت مولانا مفتی کفایت علی کافیؔ مرادآبادی علیہ الرحمہ

(شہادت: 1274ھ / 1858ء)

مولانا نفیس احمد مصباحی

تاریخِ ہند سے دل چسپی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ جنگ آزادی 1857ء میں علماے اہلِ سنت اور مشائخِ طریقت کا نہایت بنیادی کردار رہا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا کہ شمالی ہند میں انگریزوں کے خلاف مسلم راے عامہ ہموار کرنے اور پورے خطے میں انقلاب کی فضا برپا کرنے کا بنیادی کام انھیں کی قیادت وسربراہی میں ہوا۔ ان مجاہدین میں علامہ فضلِ حق خیرآبادی (م 1278ھ)، مفتی صدرالدین خاں آزردہ دہلوی (م 1285ء)، مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی (م 1274ھ/ 1858ء)، مفتی عنایت احمد کاکوروی (م 1279ھ)، مولانا رحمت اللہ کیرانوی (1308ھ)، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی (م 1289ھ/ 1873ء)، مولانا وہاج الدین مرادآبادی (م 1274ھ/ 1858ء)، مولانا رضا علی خاں بریلوی (م 1286ھ/ 1869ء)، مولانا امام بخش صہبائی دہلوی (م 1273ھ/ 1857ء)، مفتی مظہر کریم دریابادی، حکیم سعید اللہ قادری (1325ھ) وغیرہ کے انقلابی کارنامے آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں اور شہیدِ جنگ آزادی حضرت مولانا مفتی سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی علیہ الرحمۃ والرضوان کا نام اس فہرست میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

مختصر احوالِ زندگی: آپ کا نسبی تعلق نگینہ، ضلع بجنور (یو.پی.) کے ایک معزز خانوادۂ سادات سے تھا۔ آپ نے مرادآباد کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ علماے بدایوں وبریلی سے علم حاصل کیا۔ بارہویں صدی کے مجدد حضرت شاہ غلام علی نقش بندی دہلوی کے خلیفہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی 1239ھ/ 1824ء) کے شاگرد رشید حضرت شاہ ابوسعید مجددی رام پوری (م 1250ھ) سے علمِ حدیث کی تکمیل کی۔ (1) علمِ طب مولانا رحمٰن علی مصنف تذکرۂ علماے ہند کے والد مولانا حکیم شیر علی قادری سے حاصل کیا۔ مولانا کافیؔ پر اپنے استاذ ومربی حضرت شاہ ابوسعید مجددی کی شخصیت کا گہرا اثر تھا۔ اسی وجہ سے آپ کو علمِ حدیث اور تصوف سے بے حد شغف تھا، اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔

شعر و شاعری: آپ قادر الکلام، پُرگو اور صاحبِ دل شاعر تھے۔ شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی کے شاگرد شیخ مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی (م 1281ھ/ 1864ء) سے شعروشاعری میں اصلاح لیتے تھے۔(2)

عشقِ رسول ان کی غذاے روح اور قلب کا سامانِ تسکین تھا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ عشقِ رسول کے جذبات سے جب آپ کا دل مضطرب ہوتا اور فراقِ حبیب ان کی روح کا سکون وقرار چھین لیتا تو ان کے جذباتِ دروں نعتیہ اشعار کا روپ دھار لیتے، اور ان کے نازک احساسات کے سرچشموں سے عشقِ نبوی سے لب ریز منظوم آبشار جاری ہوجاتے۔ ان کی نظر میں نعتِ رسول سننا اور سنانا دونوں جہان کی سعادت مندی اور فیروز بختی کا سامان ہے، اور نعتِ مصطفیٰ میں اپنی زندگی کے گراں قدر اوقات صرف کرنے والا "سعیدِ دوجہاں" ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں ؎

ہے سعیدِ دوجہاں وہ جو کوئی لیل ونہار
نعتِ اوصافِ رسول اللہ کا شاغل ہوا

بس آرزو یہی دلِ حسرت زدہ کی ہے
سنتا رہے شمائل واوصافِ مصطفیٰ(3)

اسی جذبۂ دروں اور سوداے عشق کی کرشمہ سازی تھی کہ آپ کا دل زیارتِ حرمین طیبین کے لیے تڑپتا تھا۔ آپ کے دیوان "دیوانِ کافی"

میں جا بہ جا زیارتِ دیارِ حبیب کا شوق اپنی جلوہ سامانیاں بکھیرتا نظر آتا ہے اور ان کا طائرِ تخیل حجازِ مقدس کی پاکیزہ اور عطر بیز فضاؤں میں مسلسل پرواز کے ساتھ اس تمنا کا برملا اظہار کرتا نظر آتا ہے کہ کاش ان کے جسدِ خاکی کے بھی دن پھریں اور اسے بھی اس رشکِ جنت، سرزمین کی آبلہ پائی نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ تمناے شوق بھی پوری فرمائی اور 1841ء میں زیارتِ حرمین شریفین کا موقع عنایت فرمایا۔ آپ نے اس سفر کے متعلق ایک مثنوی بھی تحریر فرمائی جو "تجملِ دربارِ رحمت بار" کے عنوان سے منشی عبدالرحمٰن شاکر، مالک مطبع نظامی، کان پور کی کوشش اور اہتمام سے چھپ کر شائع ہوئی۔

سرکار کے سچے جانشین خلفاے راشدین کی شان میں بھی آپ کے اشعار ملتے ہیں۔ بطورِ نمونہ درجِ ذیل اشعار نذرِ قارئین ہیں۔

السلام اے چار یارانِ صفا، ارکانِ دیں
مجمعِ جود وحیا، صدق وعدالت، السلام

ثنا خوانِ نبی ہوں اور اصحابِ نبی، کافیؔ
ابوبکر وعمر، عثماں علی سے مجھ کو الفت ہے

مجھے الفت ہے یارانِ نبی سے
ابوبکر و عمر، عثماں، علی سے
محبت ان کی ہے ایمان میرا
میں ان کا مدح خواں ہوں جان وجی سے

نعت نبوی کے کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بہارِ خلد ہے روے محمد | شمیمِ جاں فزا بوے محمد
دلِ وحشی ہے زنجیریں تڑاتا | بشوقِ یادِ گیسوے محمد

یا الٰہی حشر میں خیر الوریٰ کا ساتھ ہو
رحمتِ عالم، محمد مصطفیٰ کا ساتھ ہو
یا الٰہی، ہے یہی دن رات میری التجا
روزِ محشر، شافعِ روزِ جزا کا ساتھ ہو
بعد مرنے کے بھی، کافیؔ کی ہے یارب یہ دعا
دفترِ اشعارِ نعتِ مصطفیٰ کا ساتھ ہو (4)

آپ کی شاعری میں شرعی احکام کی بھرپور پاس داری نظر آتی ہے، اس لیے عاشقِ رسول اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان آپ کی شاعری کو پسند فرماتے تھے، اور اسے شوق سے سماعت فرماتے تھے۔ جب کہ آپ عام شعرا کے اشعار قصداً سماعت نہیں کرتے تھے، کیوں کہ وہ عموماً شرعی نزاکتوں کی رعایت سے خالی ہوتے ہیں۔ الملفوظ میں ہے:

"سوا دو کے کلام کے کسی کا کلام میں قصداً نہیں سنتا، مولانا کافیؔ (مرادآبادی) اور حسن میاں مرحوم (یعنی استاذِ زمن مولانا حسن رضا بریلوی)۔ (ان دونوں کا) کلام اول سے آخر تک شریعت کے دائرے میں ہے۔ البتہ مولانا کافیؔ کے یہاں لفظ "راعنا" کا اطلاق جا بہ جا ہے، اور یہ شرعاً محض ناروا وبے جا ہے۔ مولانا کو اس پر اطلاع نہ ہوئی، ورنہ ضرور احتراز فرماتے۔..................غرض ہندی نعت گویوں میں ان دو کا کلام ایسا ہے، باقی اکثر دیکھا گیا کہ قدم ڈگمگا جاتا ہے، اور حقیقتاً نعت شریف لکھنا نہایت مشکل ہے، جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں، اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے، اگر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچا جاتا ہے، اور اگر کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے۔ البتہ حمد آسان ہے کہ اس میں راستہ صاف ہے، جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے۔ غرض حمد میں ایک جانب اصلاً (بالکل) حد نہیں، اور نعت شریف میں دونوں جانب سخت حد بندی ہے۔"(5)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی علیہ الرحمہ شہیدِ حریت حضرت مولانا کافیؔ علیہ الرحمہ کی نعتیہ شاعری سے اس قدر متاثر تھے کہ انھیں سلطانِ نعت گویاں اور اپنے آپ کو ان کا وزیر اعظم قرار دیتے ہوئے تحدیثِ نعمت کے طور پر لکھتے ہیں ؎

مہکا ہے مری بوے دہن سے عالم
یاں نغمۂ شیریں نہیں تلخی سے بہم
کافیؔ سلطانِ نعت گویاں ہے رضا
ان شاء اللہ میں وزیرِ اعظم (6)

کذب و تلبیس کا ایک بد ترین نمونہ: مذکورہ بالا رباعی میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان، حضرت مولانا کافیؔ علیہ الرحمۃ والرضوان کی میدانِ نعت گوئی میں برتری کو تسلیم کرتے ہوئے اور ان کی بارگاہ میں عقیدتوں کا خراج پیش کرتے ہوئے تحدیثِ نعمت کے طور پر کہتے ہیں:

"میری نعت گوئی کے چرچے چار دانگ عالم میں ہو رہے ہیں اور پوری دنیا میں اسے شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی ہے، اس

طرح میرے دہن کی خوشبو سے ایک عالم مہکا ہوا ہے اور نعت کے نغمۂ شیریں میں ذرا بھی تلخی کی آمیزش نہیں ہے۔ اے رضا! حضرت کافی سلطانِ نعت گویاں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مشیت سے نعت گوئی میں میں آپ کا وزیر اعظم ہوں۔"

کس قدر صاف اور واضح انداز میں حضرت کافی مرادآبادی علیہ الرحمۃ والرضوان کی میدانِ نعت گوئی میں عظمتوں کا اعتراف کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ حضرت کو نعت گوئی میں جو کمال اور مہارت عطا کی ہے اس کا اظہار کیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے: "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ." (الضحی: 11) اور اپنے پروردگار کی نعمت کا خوب چرچا کرو۔ اعلیٰ حضرت کے پیشِ نظر یہی آیتِ کریمہ ہے۔

لیکن دجل وفریب اور کذب و افترا کی مجسم تصویر دیکھنی ہو تو معروف دیوبندی عالم مولانا خالد محمود (مانچسٹر، برطانیہ) کی کتاب "مطالعۂ بریلویت" کا مطالعہ کرلو اور دیکھ لو کہ معلم الملائکہ کی وفادار ذریت نے کس طرح اس پاکیزہ رباعی کا مفہوم مسخ کیا ہے اور اللہ کے ولی، علامۂ اجل، امامِ اہلِ سنت اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان سے اپنی اندھی دشمنی کا کس طرح مظاہرہ کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

"مولانا احمد رضا خاں ان دنوں کن امیدوں سے تھے، اسے انھیں کی زبان میں سنیے۔ شاعر تھے، بات اگل دی۔

کافی سلطانِ نعت گویاں ہے رضا
ان شاء اللہ میں وزیرِ اعظم

(سلیس): اے رضا! ہم نعت خوانوں (بریلویوں) کو حکومت کی سرپرستی کافی ہے۔ ان شاء اللہ کسی نہ کسی وقت ضرور وزیرِ اعظم بنوں گا۔

ہم نے تاویل کرنے کی کوشش کی، ہوسکتا ہے شاعری کی وزارتِ عظمیٰ مراد ہو، مگر معلوم ہوا کہ شاعری میں تو آپ اپنے آپ کو وزیر نہیں، بادشاہ سمجھتے تھے۔ جو شخص اپنے آپ کو بالفعل بادشاہ سمجھتا ہو وہ وزارت کی تمنا کیسے کرے گا؟ پس ان شاء اللہ کے ساتھ جس وزارت کی امید تھی وہ شریف (مکہ) کی حمایت اور انگریزوں کی خدمت کے صلے میں ملکی وزارت تھی۔"[7]

کیا اس سے بڑھ کر اہل اللہ سے بغض و عداوت، کذب و افترا، دریدہ دہنی اور دروغ بافی کی کوئی اور مثال ہوسکتی ہے۔ لیکن جس کا خدا جھوٹ بول سکتا ہو اگر وہ خود جھوٹ بولے تو اس سے اس کی کیا شکایت؟ مگر یہ سننے کے بعد ایک مومن کی زبان سے "لعنة الله علی الکاذبین و المفترین" نکلنا ایک فطری بات ہے۔

تصنیفات: آپ صاحبِ تصنیف بزرگ ہیں۔ آپ کی تصانیف کا موضوع عموماً ذاتِ رسول، سیرتِ رسول، شمائلِ رسول اور ذکرِ رسول ہوتا ہے، جیسا کہ آپ کی کتابوں سے واضح ہے۔ درج ذیل کتابیں آپ کی یادگار ہیں:

(1) **بہارِ خلد:** یہ شمائل ترمذی شریف کا منظوم ترجمہ ہے (2) **نسیمِ جنت** (3) **مجموعہ چہل حدیث مع تشریح منظوم** (4) **خیابانِ فردوس:** یہ کتاب شیخ محقق مولانا عبد الحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ والرضوان (متوفی 1052ھ) کی کتاب "ترغیبِ اہلِ سعادت" کا منظوم ترجمہ ہے، کتاب کا موضوع فضائلِ درود شریف ہے (5) **تجملِ دربارِ رحمت بار:** یہ مثنوی سفر حرمین طیبین کے متعلق ہے (6) **مولودِ بہاریہ** (7) **جذبۂ عشق:** اس میں ستونِ حنانہ کا واقعہ بڑے والہانہ انداز میں نظم کیا ہے۔ (8) **حلیہ شریف** (9) **وفات نامہ**، یہ دونوں رسالے علاحدہ مستقل تصنیف نہیں ہیں، بلکہ آپ کی مذکورہ بالا تصنیف بہارِ خلد سے ماخوذ ہیں۔ (10) **اوقات نحو وصرف**۔ (11) **دیوانِ کافی**۔[8]

اس فہرست سے صاف واضح ہے کہ آپ کی تقریباً سبھی تصنیفات منظوم ہیں، جس سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا طبعی میلان نظم اور شعروشاعری کی جانب زیادہ تھا۔

مولانا کافی شہید علیہ الرحمہ کی علمی قابلیت کے سلسلہ میں مولانا عبد الغفور نساخ مؤلف "سخن شعرا" فرماتے ہیں کہ مولانا کافی اپنے دور کے نعت گو شعرا میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ وہ مستند عالمِ دین تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت تصنیف وتالیف میں گزرتا تھا۔[9]

مولانا کافی اور تحریکِ آزادی 1857ء: مولانا کافی علیہ الرحمہ نے تحریکِ آزادی 1857ء میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ آپ انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے اور ہندستان پر ان کے ظالمانہ تسلط سے حد درجہ بے زار، اور انھیں یہاں سے باہر کرنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ اسی لیے جب 1857ء میں انگریزوں کے خلاف تحریکِ حریت نمودار ہوئی تو آپ ان کے خلاف میدانِ عمل میں اتر آئے اور اس انگریز مخالف

جہاد میں پیش پیش رہے۔ اسی لیے آپ کا شمار تحریکِ آزادی 1857ء کے صفِ اول کے مجاہدین میں ہوتا ہے۔

جب مرادآباد میں انگریزوں کی حکومت ختم ہوئی اور نواب مجد الدین عرف نواب مجو خاں کی زیرِ سرکردگی آزاد حکومت قائم ہوئی تو آپ کو "صدر شریعت" بنایا گیا۔ آپ کی عدالت میں مقدمات کے فیصلے شرعی احکام کے مطابق ہوتے تھے۔ جناب امداد صابری صاحب کا بیان ہے:

"انگریز مرادآباد سے بھاگ کر نینی تال اور میرٹھ چلے گئے۔ نواب مجو خاں حاکمِ مرادآباد مقرر ہوگئے۔ عباس علی خاں بن اسعد علی خاں، ہندی توپ خانہ کے افسر معین ہوئے اور مولوی کفایت علی صاحب "صدر شریعت" بنائے گئے۔ انھوں نے عوام میں جہادی روح پھونکی، شہر میں ہر جمعہ کو بعدِ نماز انگریزوں کے خلاف وعظ فرماتے، جس کا بے حد اثر ہوتا تھا۔"

ڈسٹرکٹ گزیٹر مرادآباد میں ہے:

"مسلمانوں نے من حیث القوم ضلع بھر میں برٹش گورنمنٹ سے اپنی مخالفت کو نہایت صاف اور صریح طور پر ظاہر کیا ہے۔ روہیل کھنڈ کے اضلاع کی طرح مرادآباد کے ضلع میں غیرت مذہبی اور انگریزوں کی ہر بات سے نفرت کے جذبات نے مسلمانوں کو عام بغاوت پر مشتعل کیا تھا۔"[10]

نوابِ رام پور یوسف علی خاں انگریزوں کے دوست اور حامی تھے۔ جب مرادآباد میں نواب رام پور کو بالادستی حاصل ہوئی تو مولانا کافی نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد مرتب کیا۔ اس فتوے کی نقلیں مختلف مقامات پر بھجوا کر اس کی خوب نشرواشاعت کی، بلکہ کچھ مقامات پر آپ خود تشریف لے گئے۔ آنولہ ضلع بریلی میں خاص اسی مقصد کے لیے ایک ہفتہ سے زیادہ قیام رہا۔

حکیم سعید اللہ قادری بن حکیم عظیم اللہ (متوفی 1325ھ/1907ء) آنولہ ضلع بریلی میں تحریکِ آزادی کے خاص رکن اور حاکمِ آنولہ نواب کلن خاں نبیرۂ بخشی سردار خاں کے معاون اور حامی تھے اور انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ حکیم صاحب حضرت شاہ آل برکات مارہروی علیہ الرحمہ سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے اور حضرت شاہ آل احمد اچھے میاں علیہ الرحمہ (متوفی 1362ھ) کے خلیفہ شاہ میرن میاں بریلوی سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ مولانا کافی علیہ الرحمہ اور حکیم سعید اللہ صاحب ہم سبق ساتھی تھے۔ مولانا کافی جب انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد کی نقلیں لے کر آنولہ پہنچے تو ایک ہفتہ تک حکیم صاحب ہی کے مکان پر ان کا قیام رہا۔ اس دوران جہاد کے موضوع پر مولانا کی تقریریں بھی ہوئیں اور نواب مجد الدین عرف مجو خاں حاکمِ مرادآباد کا پیغام بھی نواب کلن خاں کو پہنچایا۔ اس کے بعد مولانا کافی، نواب خان بہادر خاں (نبیرۂ حافظ رحمت خاں روہیلہ) کے پاس بریلی تشریف لے گئے۔[11]

جب مولانا کافی علیہ الرحمۃ والرضوان آنولہ سے بریلی پہنچے تو وہاں وطن کو انگریزوں اور انگریز نوازوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے نواب خان بہادر خاں اور امام المجاہدین مولانا سرفراز علی صاحب سے مشورے ہوئے اور پھر جنرل بخت خاں کی ماتحتی میں جو فوج بریلی سے دہلی جارہی تھی اسی فوج کے ساتھ آپ مرادآباد واپس ہوئے۔[12]

سید محبوب حسین سبزواری مرادآبادی لکھتے ہیں:

"جس وقت مرادآباد میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ بریلی چھاؤنی کی ہندستانی سپاہ نے بغاوت کردی ہے اس خبر کے ملنے پر 29 پلٹن مقیم مرادآباد نے بغاوت کرکے سرکاری خزانہ اور ہتھیار لوٹ لیے۔ اس کے بعد شہر میں ہنگامہ برپا ہوگیا اور شہر کے عوام جو انگریز کی غلامی سے ناراض تھے تلواریں کھینچ کر فخر سے نعرہ لگاتے ہوئے سڑکوں پر نکل پڑے اور انگریزوں پر حملہ کرنا اور جگہ جگہ تلاش کرنا شروع کردیا۔ علما حضرات بھی اپنی درس گاہوں سے نکل کر عوام کے ساتھ جہاد میں شریک ہوگئے۔ انگریز اس ہنگامے سے ڈر کر میرٹھ اور نینی تال فرار ہوگئے۔

حالات کے پیشِ نظر علما حضرات نے فوری انتظام کے لیے ایک جنگی مشاورتی کمیٹی قائم کی جو شہر کا انتظام بھی کرے گی اور جنگ کے لیے وسائل و ذرائع بھی فراہم کرے گی۔ اس کمیٹی کے ایک رکن مولوی سید کفایت علی کافی تھے۔ اس کمیٹی نے ضلع مرادآباد کے اندر اور باہر جہاد کے فتوے تقسیم کرائے، جن میں انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کا شرعی حکم دیا گیا تھا۔ اس غیر منظم جہاد کو ناکام کرنے کے لیے نواب رام پور اور کچھ مقامی غداروں

کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس ناکامی کے نتیجے میں مسلمانانِ مراد آباد کو بقول سر سید احمد خاں جس تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا وہ نا قابلِ بیان ہے۔

اسی دوران 29 پلٹن اور جوش میں بھرے نوجوان عوام نے باہمی مشورے سے نواب مجد الدین خاں عرف مجو خاں کو حاکمِ مراد آباد مقرر کیا، اور عباس علی خاں کو افسر توپ خانہ مقرر کیا، مگر توپیں موجود نہیں تھیں، اور مولوی سید کفایت علی کافی کو "صدر شریعت" مقرر کیا۔ علما کے فتوے نے عوام میں ہر طرف آگ بھڑکا دی تھی۔ روہیل کھنڈ میں مسلمانوں کی برہمی کا ایک خاص سبب یہ بھی تھا کہ مذہب میں مداخلت ہونے لگی تھی۔"(13)

31/ مئی کو بریلی چھاؤنی میں بغاوت کے نتیجے میں خان بہادر خاں روہیلہ نبیرۂ حافظ رحمت خاں روہیلہ کو روہیل کھنڈ کا نواب بنایا گیا۔ اس کے بعد کے حالات بیان کرتے ہوئے سید محبوب حسین سبزواری مراد آبادی لکھتے ہیں:

"اسی دوران نواب خان بہادر خاں کو ایک خط مولوی سید کفایت علی کافیؔ کا مراد آباد کے متعلق ملا جس میں نواب رام پور کی قوم دشمن سرگرمیوں کا تفصیل سے ذکر تھا۔ نواب صاحب نے یہ خط جنرل بخت خاں کو دکھایا اور نواب رام پور کی غدارانہ حرکتوں سے آگاہ کیا اور مراد آباد میں رام پور کی فوجی مداخلت سے جو حالات پیدا ہو چکے تھے ان کے سد باب کی گفتگو کی۔ نواب صاحب (خان بہادر خاں روہیلہ) نے جنرل بخت خاں کے مشورے سے محمد شفیع رسال دار کو مع رسالہ مراد آباد جا کر قیام کرنے کا مشورہ دیا (اخبار الصنادید، از حکیم نجم الغنی خاں رام پوری) -- رسال دار محمد شفیع آنولہ ہوتے ہوئے مراد آباد پہنچے اور خود اپنے مکان میں قیام کیا اور اپنے رسالہ کو جہاں اس وقت انٹر کالج محلہ مغل پورہ میں واقع ہے، پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ دورانِ قیام، مراد آباد کے کچھ جوشیلے جوانوں کو اپنے ساتھ شامل کر کے اپنے رسالہ سے (فوجی) تربیت دلائی، اور نمبر 29 پلٹن، مقیم مراد آباد جو باغی ہو گئی تھی، اس کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔"(14)

انگریزوں کی طرف سے نواب رام پور یوسف علی خاں کو مراد آباد فتح کرنے کی اجازت مل چکی تھی اور اسی بنیاد پر نواب یوسف علی خاں نے مراد آباد کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ خان بہادر خاں حاکم روہیل کھنڈ کے لیے نواب رام پور کی مداخلت نا قابلِ برداشت تھی۔ مولانا کافی علیہ الرحمہ کے ذریعہ خان بہادر خاں روہیلہ کو حالات کا پورا علم ہو گیا تو نواب مجو خاں حاکم مراد آباد کی امداد کے لیے خان بہادر خاں نے جنرل بخت خاں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ دہلی جاتے ہوئے مراد آباد کا معرکہ سر کر لیں۔ نواب رام پور کے اندر اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ جنرل بخت خاں کی فوج سے مقابلہ کرے۔ اس لیے اس نے مراد آباد سے اپنا انتظام اٹھا لیا اور اپنے افسر واپس بلا کر میدان خالی کر دیا۔ مگر جنرل بخت خاں جب 17/ جون کو مراد آباد سے دہلی چلے گئے تو پھر نواب رام پور نے مداخلت کی اور 24/ جون 1857ء کو دوبارہ اپنی فوج مراد آباد بھیج دی۔ اس مرتبہ نواب مجو خاں کے ساتھ مصالحت کی راہ اختیار کی جس کے نتیجے میں وہ ریاست رام پور کی طرف سے سنبھل کے حاکم مقرر ہو گئے۔ بعد میں حالات ایسے رونما ہوئے کہ انگریزوں نے بے دردی کے ساتھ نواب مجو خاں کو بڑے اذیت ناک طریقے پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔(15)

سقوط مراد آباد اور مولانا کی گرفتاری:

25/ اپریل 1858ء کو جنرل مونس گورہ فوج سے مراد آباد پر حملہ آور ہوا۔ نواب مجو خاں کی سرکردگی میں مجاہدین نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور مراد آباد کو انگریزوں سے بچانے کے لیے اپنی جانیں لڑا دیں۔ نواب مجو خاں آخری وقت تک ایک مکان کی چھت پر بندوق چلاتے نظر آئے۔ سات ہتھیار بند سپاہی ان کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجے گئے، مگر وہ گرفتار نہ کر سکے، آخر وہیں انھیں گولی مار دی گئی اور انھوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

مراد آباد کے سقوط کے ساتھ ہی تمام قائدین آزادی اور انقلابی رہ نما منتشر ہو گئے، جو حکومت کے ہاتھ پڑے وہ تختۂ دار پر چڑھا دیے گئے، یا حبس دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا سنائی گئی۔(16)

اس جنگ آزادی کی ناکامی کے دو بہت پرانے اسباب تھے: اول یہ کہ کوئی مرکزی تنظیم نہیں تھی جو جنگ پر قابو پاتی، دوسرے، جنگ کو ناکام بنانے کے لیے مقامی غدار بہت ہی کوشاں تھے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر مجاہدین کو زبردست جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ ان غداروں کی مدد سے انگریز دوبارہ 24/ اپریل 1858ء کو شہر مراد آباد

اور اس کے مضافات پر قابض ہو گئے اور پھر عیسائی تہذیب کا وہ ننگا ناچ شروع ہوا جس کو تاریخِ عالم کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ع:

جسے دیکھا حاکمِ وقت نے، کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

اس وقت انگریزوں نے غداروں کو ایک اور لالچ یہ دے رکھا تھا کہ جو شخص کسی بھی مجاہد کو گرفتار کرائے گا اور پھانسی دلوائے گا، اس کی جائداد کا بڑا حصہ اس غدار کو دے دیا جائے گا۔ اس لالچ کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی مجاہد ایسا نہیں بچا جس کو غداروں نے گرفتار کروا کے پھانسی نہ دلوا دی ہو۔ جتنے بھی ساہو صاحبان ہیں یہ اسی غداری کی پیداوار ہیں۔ مولانا سید کفایت علی کافیؔ کو بھی ایک کمینہ صفت انسان نے شہید کرایا، پہلے مولانا وہاج الدین عرف منو کو شہید کرایا، پھر مولانا سید کفایت علی کافی صاحب کو۔ اس غدارِ قوم و وطن کا نام فخر الدین کلال تھا۔ (اخبار الصنادید از حکیم نجم الغنی خاں رام پوری)

مولانا کافی جنگ کے بعد اپنے مکان میں روپوش تھے کہ اس ظالم نے مخبری کر کے گرفتار کرایا۔ اس نمک حرام نے انگریز کلکٹر سے جا کر مخبری کی اور اس شرط پر گرفتار کرانے کا وعدہ کیا کہ انعام میں مولانا کی تمام جائداد اس کو دے دی جائے گی۔ یہ وعدہ لے کر وہ انگریزی فوج کے دستہ کے ہمراہ مولانا کافیؔ علیہ الرحمہ کے مکان پر پہنچ کر آواز دی۔ ملازم نے مولانا صاحب سے اجازت لے کر دروازہ کھول دیا۔ فوج کے جوان اندر داخل ہوئے۔ آپ تخت پر تشریف فرما تھے، اسی حالت میں فوجیوں نے انھیں گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے بعد اس غدار کو آپ کی جائداد میں سے ایک بڑا حصہ دے دیا گیا اور اس کا نام انگریز کے وفاداروں کی کتاب میں درج کر لیا گیا۔

گرفتاری کے بعد فوری مقدمہ کی کارروائی شروع ہو گئی۔ اس وقت انگریزوں کی کچہری کا یہ عالم تھا کہ کوئی ملزم کے بیان کو جس طرح چاہے تحریر کر دے، ملزم کو بیان دیکھنے یا وکیل کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی صفائی پیش کرنے کی کوئی اجازت ہوتی تھی۔ اس وقت انگریزوں نے ایک کمیشن قائم کیا تھا جو مقدمات کی سماعت کرتا تھا اور جج صاحبان بھی اکثریتی طبقہ کے وہ لوگ تھے جو ملک اور قوم سے غداری کر رہے تھے۔ 4/ مئی 1858ء کو اس ظالم و جابر انگریز مجسٹریٹ کے روبرو مولانا کافیؔ کا مقدمہ پیش ہوا اور بہت جلد ہی فیصلہ سنا دیا گیا۔ (اخبار الصنادید)

مقدمہ کی پوری تفصیل درج ذیل ہے:

روداد مقدمہ مولانا سید کفایت علی 4/ مئی 1858ء:

مقدمہ مسٹر جان انگلسن مجسٹریٹ کمیشن .... واقع 4/ مئی 1858ء

سرکاری مدعی .... بنام مولوی کفایت علی کافی

فیصلہ عدالت کمیشن .... چوں کہ اس مدعا علیہ ملزم نے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور عوام کو قانونی حکومت کے خلاف ورغلایا اور شہر میں لوٹ مار کی۔ ملزم کا یہ فعل صریح بغاوتِ انگریزی سرکار ہوا، جس کی پاداش میں ملزم کو سزائے کامل دی جائے۔

حکم ہوا

"مدعا علیہ پھانسی سے جان سے مارا جائے۔" فقط

دستخط انگریزی

(جان انگلسن)

۶/ مئی 1858ء

مقدمہ کی پوری کارروائی صرف دو دن میں پوری کر دی گئی۔ 4/ مئی کو مقدمہ مجسٹریٹ کے روبرو پیش ہوا اور 6/ مئی کو حکم لگا دیا گیا۔(17)

شہادت: 16/ رمضان 1274ھ مطابق 30/ اپریل 1858ء کو مولانا کافی علیہ الرحمہ گرفتار ہوئے، ان پر انگریزی حکومت کی بغاوت کے تعلق سے مختلف الزامات عائد کیے گئے۔ سرسری اور نمائشی کارروائی، ضابطہ کی خانہ پری کے لیے ہوئی، اس کے بعد اذیت ناک سزا اور پھانسی کا حکم صادر ہوا۔ مولانا کافی علیہ الرحمہ نے جیسے ہی حکم سنا، نہایت خوشی کا اظہار فرمایا۔ سزائیں شروع ہوئیں، جسم پر گرم گرم لوہا (استری) پھیری گئی، زخموں پر نمک مرچ چھڑکا گیا۔ اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے ہر طرح کا حربہ استعمال کیا گیا، مگر آپ ان اذیت ناک سزاؤں کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلتے رہے، صبر و شکر سے کام لیتے رہے اور اس نازک موقع پر بھی آپ کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی۔ جب اس مردِ مجاہد سے انگریز مایوس ہو گئے تو انھوں نے اپنی سزاؤں کے ترکش کا آخری تیر نکالا اور برسرِ عام جیل کے سامنے چوک مراد آباد میں اس عاشقِ رسول مردِ مجاہد کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ جب آپ کو سولی دینے کے لیے تختۂ دار کی جانب لے جایا گیا تو آپ کی زبان پر ایک تازہ نعتیہ غزل تھی جسے بڑے ترنم اور وجد و شوق سے بلند آواز میں پڑھ رہے تھے۔ وہ نعتیہ غزل یہ ہے۔

کوئی گل باقی رہے گا، نے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دینِ حسن رہ جائے گا

ہم صفیرو! باغ میں ہے کوئی دَم کا چہچہا
بلبلیں اڑ جائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا
اطلس وکم خواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اِس تنِ بے جان پر خاکی کفن رہ جائے گا
نامِ شاہانِ جہاں مٹ جائیں گے، لیکن یہاں
حشر تک نام و نشانِ پنج تن رہ جائے گا
جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اُس کا تن بدن رہ جائے گا
سب فنا ہو جائیں گے کافیؔ، ولیکن حشر تک
نعتِ حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا(18)

دفن کے سلسلے میں عوام کے درمیان مختلف روایات گردش کرتی ہیں۔ ایک روایت حضرت مولانا محمد عمر صاحب نعیمی کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ مولانا کافی شہید علیہ الرحمہ کا جسمِ اطہر قبر سے نکال کر دوسری جگہ منتقل کیا گیا۔ یہ واقعہ مولانا محمد عمر صاحب نعیمی کے مطابق مولانا کافی علیہ الرحمہ کی شہادت کے تقریباً 30/سال بعد کا ہے کہ قبر کسی وجہ سے کھل گئی تھی تو دیکھا کہ حضرت مولانا کافی شہید علیہ الرحمہ کا جسم اطہر شہادت کے وقت جیسا تھا ویسا ہی موجود ہے۔ حشرات الارض سے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ جسمِ اطہر کے محفوظ ہونے کی خبر سن کر عوام کا بہت بڑا مجمع دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا۔ مولانا محمد عمر نعیمی صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے نانا شیخ کرامت علی ٹھیکے دار نے جسمِ اطہر کو جیل خانہ کے پیچھے دفن کر دیا۔

اور اسی واقعہ کی دوسری شہادت جناب مولانا سید ظفر الدین احمد مرحوم بن حضرت مولانا سید نعیم الدین صاحب مراد آبادی کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک سڑک اس مقام سے نکالی جا رہی تھی، جہاں حضرت مولانا کافی علیہ الرحمہ کا مزار تھا اور مزار کا نشان نمایاں نہیں تھا۔ مزدور کھدائی کا کام کر رہے تھے کہ آپ کی قبر کھل گئی اور مزدوروں کا پھاوڑا مولانا کافی علیہ الرحمہ کی پنڈلی پر لگا۔ جسمِ اطہر اسی طرح تر و تازہ تھا جیسا شہادت کے وقت تھا۔ بڑے بوڑھے لوگوں نے چہرۂ مبارک دیکھ کر شناخت کر لیا اور بھاری تعداد میں لوگ زیارت کرنے دوڑ پڑے۔ مزدوروں نے انجینیر سے بیان کیا۔ انجینیر خود آیا اور میت کو صحیح سلامت دیکھ کر ڈر گیا اور عوام کو ہٹا کر بڑے احترام کے ساتھ قبر پر دوبارہ تختہ وغیرہ لگوا کر بالکل ٹھیک کرا دیا اور سڑک کا رخ تبدیل کر دیا جس کی وجہ سے آج بھی اس مقام پر سڑک کچھ ٹیڑھی ہے۔ جسم کسی دوسری جگہ منتقل نہیں ہوا۔

مراد آباد کے لوگ مولانا سید ظفر الدین نعیمی مراد آبادی کے بیان سے زیادہ اتفاق کرتے ہیں، اور اس بیان کو مولانا امداد صابری دہلوی صاحب نے بھی اپنی کتاب "شہیدانِ وطن مراد آباد" میں تحریر کیا ہے۔(19)

حواشی اور حوالے

(1) **شاہ ابو سعید مجددی رام پوری:** آپ کی ولادت 2/ذی قعدہ 1196ھ/1781ء کو رام پور میں ہوئی۔ والد کا نام حضرت شاہ صفی القدر تھا۔ آپ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی نسل سے ہیں۔ گیارہ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ علوم عقلیہ ونقلیہ مولانا شرف الدین رام پوری مفتی عدالت رام پور، اور شاہ رفیع الدین دہلوی سے حاصل کیے۔ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سے سندِ حدیث حاصل کی۔ اپنے والد ماجد سے سلسلۂ نقش بندیہ مجددیہ میں بیعت ہوئے۔ پھر والد ماجد کے اشارے پر حضرت شاہ درگاہی رام پوری (متوفی 1226ھ/1811ء) سے طریقۂ قادریت میں بیعت کی۔ بارہ سال مسلسل ان کی خدمت میں حاضر رہے اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ 1225ھ میں دہلی میں بارہویں صدی کے مجدد حضرت شاہ غلام علی دہلوی (متوفی 1240ھ) کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ چند ماہ میں سلوک مجددی کی تکمیل کر کے سلسلۂ نقش بندیہ مجددیہ کی خلافت سے بہرہ ور ہوئے۔ شیخ و مرشد ہونے کے باوجود شاہ غلام علی دہلوی علیہ الرحمہ آپ کی بڑی قدر کرتے، یہاں تک کہ جب کبھی آپ سفر سے واپس آتے تو شاہ صاحب استقبال کے لیے باہر نکلتے۔ جب شاہ غلام علی صاحب بیمار ہوئے تو آپ کو لکھنؤ سے بلا کر خانقاہ کی خدمت سپرد کی۔ 1249ھ میں حج و زیارت سے شاد کام ہوئے۔ عید الفطر کے دن 1250ھ بروز یک شنبہ عصر و مغرب کے درمیان ٹونک میں وصال ہوا۔ لاش تابوت میں رکھ کر دہلی لائی گئی اور چالیس روز بعد حضرت شاہ غلام علی دہلوی قدس سرہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ آپ کے دونوں فرزند شاہ احمد سعید مجددی اور شاہ عبد الغنی مجددی علومِ ظاہر و باطن سے آراستہ ہو کر امام و مقتدا ہوئے۔
(تذکرہ علمائے اہلِ سنت، از: مولانا محمود احمد قادری، ص:19-20، مطبوعہ سنی دارالاشاعت علویہ رضویہ، فیصل آباد، پاکستان، 1992ء)

(2) **شیخ مہدی علی خاں ذکی مراد آبادی**، اردو کے مشہور ترین شاعر شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی کے شاگرد تھے، لکھنؤ اور رام پور کے درباروں سے وابستہ رہے۔ لکھنؤ سے "ملک الشعرا" کا خطاب ملا تھا۔ اپنے دور کے نام ور شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ مراد آباد میں آپ کے چار شاگرد تھے: (1) مولانا سید کفایت علی کافیؔ (2) مولوی محمد حسین تمناؔ (3) مولانا معین الدین نزہتؔ والد ماجد حضرت صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی خلیفۂ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی و صاحب تفسیر خزائن العرفان (4) مولانا شبیر علی خاں تنہاؔ۔ یہ چار یار باصفا مشہور تھے۔ شیخ ذکی مراد آبادی کا بہتر سال کی عمر میں 1281ھ/1864ء میں انتقال ہوا۔
(علمائے ہند کا شان دار ماضی، ج:4، ص:376)

(3) چند ممتاز علمائے انقلاب 1857ء، از: مولانا یٰسین اختر مصباحی، ص:91 مطبوعہ دار القلم دہلی 1428ھ/2007ء

(4) مراد آباد- تاریخ جد و جہد آزادی، از: سید محبوب حسین سبز واری، ص:141 مطبوعہ اسلامی بک ہاؤس، مراد آباد، مارچ 2000ء

(5) الملفوظ، مرتبہ: مفتیِ اعظم ہند علامہ مصطفیٰ رضا نوری بریلوی، ج:2، ص:39، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی، 1427ھ/2006ء (بہ حذف و تلخیص)

(6) انگریز نوازی کی حقیقت، از: مولانا یٰسین اختر مصباحی، ص:60 مطبوعہ دار القلم، دہلی 1428ھ/2007ء

(7) مطالعۂ بریلویت، ج:1، ص:235-236 حافظی کتب خانہ، دیوبند

(8) مقالہ محمد ایوب قادری، بی اے، مطبوعہ رسالہ العلم، کراچی، شمارہ: اپریل تا جون 1957ء

(9) چند ممتاز علمائے انقلاب 1857ء، ص:99

(10) ترجمان اہلِ سنت کراچی، جنگ آزادی 1857ء نمبر، ص:97

(11) ایضاً، ص:167-168

(12) ایضاً، ص:97

(13) مراد آباد- تاریخ جد و جہد آزادی، از: سید محبوب حسین سبز واری، بحوالہ چند ممتاز علمائے انقلاب 1857ء، از: مولانا یٰسین اختر مصباحی، مطبوعہ دار القلم دہلی 1428ھ/2007ء

(14) مراد آباد- تاریخ جد و جہد آزادی، از: سید محبوب حسین سبز واری، ص:203 مطبوعہ اسلامی بک ہاؤس، مراد آباد، مارچ 2000ء

(15) چند ممتاز علمائے انقلاب 1857ء، از: مولانا یٰسین اختر مصباحی، مطبوعہ دار القلم دہلی 1428ھ/2007ء

(16) (الف) جنگ آزادی نمبر، العلم، کراچی، شمارہ جون 1957ء
(ب) ترجمان اہلِ سنت کراچی، جنگ آزادی 1857ء نمبر، ص:97-98

(17) مراد آباد- تاریخ جد و جہد آزادی، از: سید محبوب حسین سبز واری، ص:141 تا 142، بحوالہ چند ممتاز علمائے انقلاب 1857ء، از: مولانا یٰسین اختر مصباحی، مطبوعہ دار القلم دہلی، ص:95-97

(18) چند ممتاز علمائے انقلاب 1857ء، ص:94-95

(19) مصدر سابق، ص:98-99

......(ص:60 کا بقیہ)......

غلام رسول چنڑ کے مزار کے عقب میں بستی ملوک شاہ کے گورستان میں واقع ہے۔

جناب فضل محمود انصاری شہید ملتان:

جناب فضل محمود انصاری حضرت حافظ محمد جمال اللہ والدین چشتی نظامی ملتانی قدس سرہ العزیز کے مرید و خلیفہ تھے۔

"آپ کو علم و ادب سے بے حد شغف تھا، آپ کے چند ایک انگریزوں کے خلاف باغیانہ خطوط ہماری نظر سے گزرے ہیں جو فارسی زبان میں ہیں۔"(6)

جب ملتان پر انگریزوں نے حملہ کیا تو آپ حضرت منشی غلام شہید ملتانی کے ہم راہ تھے۔ ملتان کے قلعہ پر جناب فضل محمود انصاری انگریزوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ آپ کا مزار شریف موضع ڈومرہ پیراں غائب ملتان کے قریب گورستان میں موجود ہے۔ 17/ذی الحجہ 1267ھ تاریخِ وصال ہے۔

جناب مولانا عبد العزیز انصاری ثانی:

آپ حضرت مولانا عبد العزیز انصاری کے پر پوتے تھے، ملتان کے باشندہ تھے۔ جب انگریزوں نے ملتان پر حملہ کیا تو آپ نے اپنے وعظ کے درمیان برطانویوں کے خلاف تقریریں کیں۔ آپ ممتاز ادیبِ اہلِ سنت تھے۔ آپ حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی علیہ الرحمہ کے مرید و خلیفہ تھے، جیسا کہ آپ کی تحریروں سے آپ کی علمی، ادبی، فنی قابلیت واضح ہے۔ آپ انگریزوں کے ہاتھوں ملتان کے قلعہ پر شہید ہو گئے۔

آپ کی تاریخِ شہادت 17/ذی الحجہ 1267ھ ہے۔(7)

حوالہ جات

(1) جناب مولانا عبد الہادی صاحب، قلمی مخطوطہ، ص:9 مملوکہ اسد نظامی
(2) جناب فضل عثمانی صاحب ڈیرہ غازی خاں، قلمی مخطوطہ، ص:121، مملوکہ جناب قاضی فضل رسول جام پوری مرحوم
(3) جناب محمود علی صاحب پاک پٹن شریف، تاریخ اجودھن مطبوعہ، ص:141 مطبوعہ رام پور
(4) مرزا عثمان خاں بدایونی، رسالہ ذو القرنین بدایوں، ص:17، ماہ اپریل 1951ء
(5) حضرت مولانا عبد المجید صاحب خیر پوری، قلمی مخطوطہ، ص:241 مملوکہ اسد نظامی
(6) حضرت مولانا قاضی نور مصطفیٰ صاحب انصاری، تاریخ انصاریان، قلمی، ص:609 مملوکہ اسد نظامی
(7) ایضاً

تحریکِ آزادی

اور مفتی عنایت احمد کاکوروی

مولانا اختر حسین فیضی مصباحی

انقلاب 1857ء کے حوالے سے علماے کرام نے جو قربانیاں پیش کیں انھیں فراموش کرکے آزادیِ ہند کی تاریخ رقم نہیں کی جاسکتی۔ مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مفتی رضا علی بریلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی، مولانا وہاج الدین مرادآبادی، مولانا لیاقت علی الٰہ آبادی، مولانا سید کفایت علی کافی مرادآبادی، مولانا امام بخش صہبائی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، علامہ فضل حق خیرآبادی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی وغیرہ۔ یہ وہ دانش ورانِ دین و دانش اور علم بردارانِ حریت ہیں جو اپنے سروں میں آزادیِ ہند اور حب الوطنی کا سودا لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ انھیں جاں باز علما میں مفتی عنایت احمد کاکوروی کا اسم گرامی بھی آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ انگریزوں کے خلاف بریلی (روہیل کھنڈ) کے محاذ سے نواب خان بہادر خاں کی قیادت میں سرگرم عمل رہے اور دادِ شجاعت دی۔ ذیل کی سطور میں اسی مردِ مجاہد کا ذکرِ خیر پیش ہے۔

نام و نسب: نام عنایت احمد اور خطاب خان بہادر ہے۔ آپ قریشی النسل تھے۔ اکتیسویں پشت میں نسب شریف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد کریم عبد مناف سے مل جاتا ہے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

مفتی عنایت احمد (1) بن شیخ محمد بخش (2) بن شیخ غلام محمد (3) بن شیخ لطف اللہ (4) بن شیخ غلام مجتبیٰ (5) بن شیخ محمد غوث (6) بن قاضی عثمان (7) بن قاضی عبد النبی (8) بن قاضی محمود (9) بن قاضی الهداد (10) بن قاضی خضر (11) بن قاضی محمد (12) بن قاضی ضیاء الدین (13) بن امیر حسام (14) بن عیسیٰ (15) بن یوسف (16) بن امیر احمد (17) بن امیر طاہر (18) بن امیر مصطفیٰ (19) بن امیر دانیال (20) بن عبدالعزیز (21) بن حجاج (22) بن عباس (23) بن اسحاق (24) بن ابی عمر (25) بن عامر (26) بن زبیر (27) بن رضوان (28) بن عبید (29) بن ابی (30) بن کعب (31) بن عبد مناف جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(کواکب، ص: 197-198 از مسعود انور علوی کاکوروی)

ولادت اور خاندان: آپ اپنے وطن دیوہ ضلع بارہ بنکی میں 9ر شوال 1228ھ مطابق 15را کتوبر 1813ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ انگریز پوری طرح ہندستان پر قابض تھے، فرنگی تعلیم عروج پر تھی اور اسلامی قدریں پامال ہو رہی تھیں اور مسلمان سیاسی طور پر صفر تھے۔ گویا مفتی صاحب نے عہدِ فرنگی کے اس اتار چڑھاؤ کو بہ نظرِ عمیق دیکھا۔ بچپن میں آپ اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ ترکِ وطن کرکے کاکوری ضلع لکھنؤ چلے آئے۔ خاندان کے قدرے حالات یوں ہیں:

"مفتی صاحب کے اجداد میں امیر حسام نامی ایک بزرگ بغداد سے ترکِ وطن کرکے ہندستان آئے اور قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی کے ایک محلّہ میں قیام کیا، جو ان کے قیام کی وجہ سے حجازی محلّہ کہا جانے لگا (یہ محلّہ بعد میں کثرتِ استعمال سے حجاجی محلّہ کہا جانے لگا) مفتی صاحب کے والد منشی محمد بخش صاحب کا نانیہال اودھ کا مشہور و مردم خیز قصبہ کاکوری تھا، چناں چہ والد ماجد اور عم مکرم شیخ عبد الحبیب صاحب نے مع اپنے قریبی اعزہ کے نانیہال میں سکونت اختیار کی۔ اس وقت سے یہ لوگ کاکوری کہے جانے لگے۔ حضرت مفتی صاحب کی اولاد آج بھی کاکوری میں قیام پذیر ہے۔" (کواکب، ص: 197)

آپ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ مفتی صاحب کے جد کریم امیر حسام نے بغداد سے ہجرت کرکے دیوہ ضلع بارہ بنکی کے جس محلّہ میں سکونت اختیار کی وہ محلّہ حجازی کہا جانے لگا اور کثرتِ استعمال سے حجاجی مشہور ہوا۔ بعض نے یہ خیال ظاہر کیا کہ امیر حسام حجاج بن یوسف ثقفی حاکم عراق کی اولاد سے تھے اس لیے ان کی اولاد حجاجی کہلائی اور حجاجی محلّہ اسی وجہ سے مشہور ہوا۔

لیکن راقم سطور کے خیال میں محلّہ کا نام حجازی اور اس کی بگڑی ہوئی صورت حجاجی کسی طرح درست نہیں، اس لیے کہ امیر حسام بغدادی النسل تھے اور بغداد کا خطۂ حجاز سے کوئی تعلق نہیں کہ انھیں حجازی تسلیم کرکے ان کی اقامت گاہ کو محلّہ حجازی کہہ دیا جائے۔

استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

اب رہی بات حجاجی کی تو اس میں سوانح نگاروں کو سہو واقع ہوا ہے کہ حجاج بن یوسف ثقفی کی طرف اس کا انتساب کردیا، جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ امیر حسام قریشی النسل تھے اور حجاج بن یوسف، ثقفی تھا۔ اس لیے قرینِ قیاس یہ ہے کہ حجاج بن عباس قریشی کی طرف نسبت کرتے ہوئے "حجاجی" کہا جائے جو امیر حسام کے آبا و اجداد میں آٹھویں نمبر پر آتے ہیں۔

تحصیل علم: مفتی صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے رام پور، دہلی اور علی گڑھ کا یکے بعد دیگرے سفر کیا۔ 1241ھ/1825ء میں تیرہ سال کی عمر میں رام پور گئے۔ وہاں مولانا سید محمد بریلوی سے صرف ونحو کی تحصیل کی۔ اس کے بعد مولانا حیدر علی ٹونکی (1273ھ) اور مولانا نور الاسلام سے دوسری درسی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد دہلی کا سفر کیا جہاں مولانا شاہ اسحاق دہلوی (م1262ھ/1845ء) سے حدیث کا درس لیا۔ دہلی سے علی گڑھ آئے، جہاں علامۂ زماں حضرت مولانا بزرگ علی مارہروی (م1262ھ/1845ء) سے قلعہ کی جامع مسجد میں معقولات و منقولات کا درس لیا۔ مولانا بزرگ علی مارہروی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین علیہما الرحمہ کے نام ور شاگردوں میں سے تھے۔ (کواکب، ص: 199-198 و مضمون پروفیسر آفتاب احمد نقوی، مشمولہ تسہیل تواریخ حبیب الٰہ)

تدریس: حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ ابھی فراغتِ تعلیم کے بعد علی گڑھ ہی میں تھے کہ اسی دوران استاذ گرامی حضرت مولانا بزرگ علی مارہروی کا انتقال ہو گیا (رحمۃ اللہ علیہ) آپ کی ذہانت و فطانت دیکھتے ہوئے ذمہ دارانِ مدرسہ نے آپ کو استاذ کی جگہ پر تدریس کے لیے منتخب کرلیا۔ مسعود احمد علوی کاکوروی لکھتے ہیں:

"ابھی مفتی صاحب علی گڑھ ہی میں تھے کہ استاذِ گرامی کی وفات ہو گئی، چناں چہ ان کی جگہ آپ اسی مدرسہ میں مدرس ہو گئے۔ اس طرح مفتی صاحب کی تدریسی زندگی کا مکمل طور پر آغاز ہو گیا۔ مفتی صاحب پورے ایک سال مسندِ تدریس پر متمکن رہے، اس کے بعد علی گڑھ ہی میں مفتی و منصف کے عہدے پر تقرر ہو گیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جس میں مفتی صاحب کے روبہ رو استاذ العلما مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی متوفی 1334ھ/1915ء اور مولانا سید حسین شاہ بخاری جیسے نام ور شاگردوں نے زانوے شاگردی تہ کیا تھا۔ مفتی صاحب ملازمت ہی کے دوران تدریس و تصنیف کے کام میں بھی برابر مشغول رہتے۔ "علم الفرائض و ملخصات الحساب" وغیرہ قیامِ علی گڑھ کے زمانے کی کاوشات ہیں۔ علمِ ریاضی و ادب میں خاص کمال حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو افہام و تفہیم کا وہ جوہر عطا فرمایا تھا کہ دقیق سے دقیق مسئلہ بھی طالب علم کے ذہن میں نقش کالحجر ہو جاتا تھا۔ تدریسی کمال کی بابت مولانا سید حسین شاہ صاحب بخاری فرماتے تھے:

مفتی صاحب مجھ کو ہدایہ اجلاس پر پڑھاتے، میں حاضر رہتا، جب دورانِ مقدمہ میں فرصت ملتی، اشارہ ہوتا، میں پڑھنا شروع کردیتا۔ اسی اثنا میں پھر کام میں مصروف ہو جاتے، باوجود اس کے ایسا پڑھایا کہ ساری عمر اس کی یاد رہی۔" (استاذ العلما از نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ کواکب، ص: 199-200)

جامع مسجد کے جس مدرسہ میں مفتی صاحب نے تدریس کا آغاز کیا وہ مدرسہ عہد محمد شاہی میں بانیِ مسجد نواب ثابت خاں والی کول (علی گڑھ) نے قائم کیا تھا۔ استاذ کی توجہ روحانی اور حضرت مفتی صاحب کے اہتمام و کوشش کی وجہ سے اس مدرسے نے مستند تعلیم گاہوں میں اپنا ایک وقار بنالیا۔ یہی وجہ تھی کہ دور و نزدیک سے طلبہ کشاں کشاں اس طرف رجوع کرتے اور علمی تشنگی بجھاتے۔

علمی شغل اور بریلی کا قیام: علی گڑھ میں قیام کے دوران حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تدریسی خدمات کے ساتھ تحریری شغف بھی رکھا اور ملازمت بھی اختیار کی۔ پہلے منصف و مفتی کے عہدے پر فائز ہوئے، کچھ ہی عرصہ بعد بحیثیت صدر امین آپ کا بریلی تبادلہ ہو گیا، اس کے بعد صدر الصدور کے اہم منصب پر فائز ہوئے۔ مسعود احمد علوی کاکوروی لکھتے ہیں:

"مفتی صاحب علی گڑھ میں عہدۂ منصفی و قضا پر دو سال اور مفتی کے عہدے پر تین سال رہے۔ وہاں سے بحیثیت صدر امین آپ کا بریلی تبادلہ ہو گیا۔ مولانا لطف اللہ صاحب بھی، جن کی تعلیم مکمل نہ ہو پائی تھی، بریلی ساتھ گئے۔ وہاں جملہ کتب درسیہ ختم کیں۔ اختتامِ درس کے بعد استاذِ گرامی نے شاگرد رشید کو اپنے ہی اجلاس کا سررشتہ دار مقرر کیا۔ یہاں بھی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رہا۔ بریلی کے قیام کی مدت تقریباً چار سال ہے۔ یہاں کے مشاہیر نے آپ کے آگے زانوے تلمذ تہ کیا، جن میں قاضی عبد الجلیل صاحب قاضیِ شہر، مولوی فدا حسین صاحب منصف بریلی اور نواب عبد العزیز خاں

نبیرۂ حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بریلی میں اس وقت مولوی رضی الدین خاں کاکوروی (متوفی 1274ھ/1856ء) بن مولوی علیم الدین خاں بن قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین علی خاں ثاقب صدر الصدور تھے۔ بریلی کے دورانِ قیام میں آپ (مفتی صاحب) نے ''ضمان الفردوس، محاسن العلم، فضائل علم و علماے دین اور ہدایات الاضاحی'' وغیرہ تصنیف فرمائیں۔'' (کواکب، ص:200-201، بہ حوالہ استاذ العلما از نواب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی و تذکرۂ مشاہیر کاکوری، ازمولانا شاہ علی حیدر قلندر)

1855ء میں بریلی میں سرکاری سرپرستی سے قائم ہونے والے کتب خانے کی مجلس انتظامیہ میں آپ (مفتی عنایت احمد کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ) کو آپ کے علمی مقام و مرتبہ کے پیش نظر رکن منتخب کیا گیا، جو اس دور میں آپ کے لیے بڑا اعزاز تھا۔ (مضمون پروفیسر آفتاب احمد نقوی مشمولہ تسہیل تواریخ حبیب الٰہ از اختر حسین فیضی)

انقلاب 1857ء: حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عہدۂ صدر امین سے ترقی کرکے 1273ھ/1856ء میں آگرہ کے صدر الصدور مقرر ہوئے۔ تقرری کا حکم نامہ بھی آگیا مگر اسی دوران جنگ آزادی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ فرنگیوں کے خلاف متحد ہو کر اہلِ ہند نے علم بغاوت بلند کیا اور ملک سے انگریزوں کے نکالنے کی تحریک زور پکڑتی گئی۔ ملک کا نظام اس طرح درہم برہم ہونے کی وجہ سے حضرت مفتی صاحب آگرہ نہ جاسکے، بریلی اور رام پور ہی میں قیام کیا اور مجاہدینِ آزادی کے قدم سے قدم ملا کر انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائی کی۔ اس سلسلے میں میاں عبدالرشید اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

''آپ بریلی میں نواب بہادر خاں کے زیر قیادت جہادِ حریت کی تنظیم کے لیے سرگرمِ عمل رہے۔ ان دنوں روہیل کھنڈ (بریلی) مجاہدینِ آزادی کا اہم مرکز تھا اور مولانا احمد رضا خاں بریلی کے جد امجد مولانا رضا علی خاں اس تحریک کے قائدین میں سے تھے۔ مفتی عنایت احمد نے مجاہدین کی تنظیم ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ نواب بہادر خاں کے دست راست کی حیثیت سے مختلف معرکوں میں عملی حصہ بھی لیا۔''

(ترجمانِ اہلِ سنت کراچی، جنگ آزادی 1857ء نمبر، ص:102)

میاں عبدالرشید مزید لکھتے ہیں:

مفتی صاحب نے جاں بازوں کا ایک خاص دستہ تیار کیا تھا، جن کی معرکہ آرائی سے اسلام کے دورِ اول کے مجاہدین کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اس دستہ کے ایک معرکہ کا آنکھوں دیکھا حال ایک انگریز سارجنٹ یوں لکھتا ہے:

''ان لوگوں کی داڑھیاں سفید تھیں، انگلی میں چاندی کی انگوٹھی، جس کے نگینہ پر ''اللہ'' کندہ تھا، پہنے ہوئے تھے۔ کمر میں سبز رنگ کا پٹکا اور سر پر سفید پگڑی تھی، جس پر سرخ رنگ کے چھینٹے تھے۔ حملہ آور ہونے سے پہلے ان کا نوجوان سردار ایک چوبیس سالہ بے ریش نوجوان تھا۔ صفوں سے نکل کر آگے آیا اور ہم سے یوں مخاطب ہوا: کیا تم کافروں میں کوئی ایسا حوصلہ مند ہے جو میرا مقابلہ کرے، اگر ہے تو سامنے آئے۔ ہماری صفوں میں سناٹا چھا گیا۔ اس نے دوبارہ چیلنج کیا مگر اس کو جواب نہ ملا، پھر وہ تلوار نکال کر ہمارے لشکر پر اکیلا ہی حملہ آور ہوا اور اس نے چشم زدن میں اٹھارہ سپاہیوں کو زخمی کر دیا، آخر شہادت پائی، مگر جب تک جسم میں جان باقی رہی تلوار کے جوہر دکھاتا رہا۔'' (ترجمانِ اہلِ سنت کراچی، جنگ آزادی 1857ء نمبر، ص:102)

اسیری: حضرت مفتی صاحب نواب روہیل کھنڈ نواب بہادر خاں کی تنظیم حریت کے اہم رکن تھے۔ نواب کی تنظیم کو مضبوط کرنے کے لیے اور انگریزوں کے خلاف جہاد کی موافقت میں اور نواب کی حکومت کی مالی امداد کے لیے آپ نے بھی فتویٰ دیا۔ لیکن شومیِ قسمت کہ تحریکِ آزادی کا نتیجہ باشندگانِ ہند کے حق میں بہتر ثابت نہ ہوا اور انگریزوں نے پورے ہندستان پر بلاشرکت غیرے غلبہ حاصل کرلیا اور اقتدار پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد مجاہدینِ آزادی کے خلاف انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیش تر ہندستانی خصوصاً مسلمان انگریزوں کے ظلم وستم کا شکار ہوئے۔ نواب کی مالی امداد کے تعلق سے حضرت مفتی صاحب کا فتویٰ بھی کسی طرح انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا۔ اس جرم میں ان پر بھی بغاوت کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا گیا اور حبس دوام بہ عبور دریاے شور کی سزا سنا کر انھیں جزیرہ ہاے نڈمان بھیج دیا گیا۔ ان کے علاوہ اور بھی مجاہد علماے کرام گرفتار کر کے انڈمان بھیجے گئے۔ ان میں مولوی ایوب خاں کیفی، مولوی جعفر علی تھانیسری، مفتی مظہر کریم دریابادی وغیرہ شامل تھے۔ بعد میں علامہ فضل حق خیرآبادی بھی بغاوت کے جرم میں گرفتار ہو کر انڈمان میں قید کردیے گئے۔ علامہ انڈمان کی آب وہوا اور ماحول کی عکاسی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''(انڈمان) کی نسیم صبح بھی گرم وتیز ہوا سے زیادہ سخت اور

اس کی نعمت زہرِ ہلاہل سے زیادہ مضر تھی، اس کی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں، اس کا آسمان غموں کی بارش کرنے والا، اس کا بادل رنج وغم برسانے والا، اس کی زمین آبلہ دار، اس کے سنگ ریزے بدن کی پھنسیاں اور اس کی ہوا ذلت و خواری کی وجہ سے ٹیڑھی چلنے والی تھی۔ ہر کوٹھری پر چھپر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں، ہوا بدبودار اور بیماریوں کا مخزن تھی، مرض سستا اور دوا گراں، بیماریاں بے شمار خارش وقوبا (وہ مرض جس سے بدن کی کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے) عام تھی، بیمار کے علاج، تندرست کے بقاے صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہ تھی۔'' (الثورۃ الہندیہ، ص:77-78 از: علامہ فضل حق خیرآبادی، ترجمہ عبدالشاہد خاں شروانی)

ظاہر ہے کہ موسم اور آب وہوا سے حضرت مفتی صاحب بھی دوچار ہوئے، نہ جانے کن کن امراض سے سامنا کرنا پڑا، لیکن اس بدنام جزیرہ کو اہلِ علم کے ورودِ مسعود نے علم کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی رقم طراز ہیں:

''علامہ (فضل حق خیرآبادی) جزیرۂ انڈمان پہنچے۔ مفتی عنایت احمد کاکوری صدر امین بریلی وکول مفتی مظہر کریم دریابادی اور دوسرے مجاہد علما وہاں پہلے پہنچ چکے تھے۔ ان علما کی برکت سے یہ بدنام جزیرہ دار العلوم بن گیا۔ ان حضرات نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں بھی برقرار رکھا۔ خرابیِ آب وہوا، تکالیفِ شاقہ اور جدائیِ احبہ واعزہ کے باوجود علمی مشاغل جاری رہے۔ مفتی صاحب نے علم الصیغہ جیسی صرف کی مفید کتاب جو آج تک داخلِ نصاب ہے، وہیں لکھی۔ سرکاری ڈاکٹر حکیم امیر خاں کی فرمائش سے تواریخ حبیبِ الٰہ (1275ھ) بھی تالیف کی۔ (یہی تاریخی نام بھی ہے)۔ ان دونوں کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کے سینے علم کے سفینے بن گئے تھے۔ تاریخی یاد داشت، ترتیب واقعات، قواعد فنون، ضوابط علوم، سبھی حیرت انگیز کرشمے دکھا رہے ہیں۔ ایک انگریز کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کیا جو دو برس میں ختم ہوا اور وہی رہائی کا سبب بنا۔'' (باغی ہندستان (سوانح علامہ فضل حق)، ص:225 از مولانا عبدالشاہد خاں شروانی، مطبوعہ المجمع الاسلامی، مبارک پور)

تقویم البلدان کے ترجمہ کے سلسلے میں خود حضرت مفتی صاحب قبلہ کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

''ایک روز ہم چند لوگ (علما) بیٹھے ہوئے تھے کہ انگریز حاکم آیا اور ''تقویم البلدان'' کے اردو ترجمہ کی فرمائش کی، مگر ہر ایک نے بغیر کسی لغت کی موجودگی کے اس کے ترجمہ سے معذوری ظاہر کی۔ میں نے بسم اللہ پڑھ کر اس کو لے لیا اور ترجمہ شروع کیا جو بحمد اللہ دو سال میں مکمل ہوا۔ پوری کتاب میں مجھے صرف دو الفاظ ایسے ملے جن کے معانی مجھے معلوم نہ تھے، چناں چہ ایک معنیٰ میں نے سیاق وسباق دیکھ کر لکھ دیے۔ یہاں (ہندستان) آکر جب لغت میں تلاش کیے تو بحمد اللہ پہلے لفظ کے معنیٰ تقریباً وہی تھے اور دوسرا لفظ مجھے مل ہی نہیں سکا۔''

(کواکب، ص:202، از: مسعود احمد علوی کاکوروی)

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی حضرت مفتی صاحب کی رہائی کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

انگریز حاکم اس ترجمہ سے بہت خوش اور مفتی صاحب کی ذہانت وقوت حافظہ سے بہت متاثر ہوا۔ چناں چہ اس نے رہائی کی کوششیں شروع کیں اور بالآخر 1277ھ/1860ء میں آپ رہائی پا کر کاکوری آئے۔

شاگرد رشید مولانا لطف اللہ علی گڑھی کاکوری پہنچے اور شفیق استاذ کی خدمت میں حاضر ہو کر تاریخ پیش کی۔

چوں بہ فضلِ خالقِ ارض و سما
اوستادم شد ز قیدِ غم رہا
بہر تاریخِ خلاصِ آں جناب
بر نوشتم اِنَّ اُستَاذِیْ نَجَا

1277ھ

(استاذ العلما، ص:10-11 کواکب، ص:203)

وطن واپسی پر حضرت مفتی صاحب اپنی تصنیفات بھی ساتھ لائے۔ علامہ فضلِ حق خیرآبادی نے اپنے رسائل ''الثورۃ الہندیہ'' اور ''قصائد فتنۃ الہند'' حضرت مفتی صاحب ہی کے ذریعہ 1277ھ میں اپنے خلف رشید مولانا عبدالحق صاحب کے پاس بھیجا تھا اور کہا تھا کہ ابن میاں کو جاکر یہ تحفہ دے دینا۔ (باغی ہندستان، ص:226، از: مولانا عبدالشاہد خاں شروانی)

(باقی صفحہ ۹۳ پر)......

مجاہدِ آزادی

مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی

مولانا صابر رضا رہبر مصباحی

برٹش غلامی کی چکی میں پستے ہوئے ہندستانی سپوتوں کے لہو میں حریت کی گرمیِ پیدا کرنے والے ایک مرد مجاہد کا نام مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی ہے۔

انگریزوں کے خلاف ان کی ہمہ گیر شخصیت ایک ایسے آتش فشاں کی سی ہے جس نے اپنی سیاسی بصیرت کی ایک ادنیٰ چنگاری کے سہارے غلامی کی دنیا میں آگ لگا دی۔ انقلاب 1857ء میں مفتی صاحب کی خدمات آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں، اگرچہ کچھ خود ساختہ مورخوں نے ان کی خدمات کو شک وشبہہ کے خانے میں ڈال کر فراموش کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے، مگر مفتی صاحب ان جیالوں میں سے ہیں جو تاریخ کے سینے میں اپنا نام خود نقش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

نام: آپ کا نام محمد صدرالدین اور تخلص آزردہ دہلوی ہے۔ اکبر شاہ ثانی کے دورِ سلطنت 1204ء میں آپ کی ولادت ہوئی، لفظ چراغ سے تاریخِ ولادت نکلتی ہے۔

خاندانی پس منظر: مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی نسلاً کشمیری تھے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ خواجہ بہاء الدین خوارزمی فاروقی شہنشاہ اکبر کے زمانے میں وہاں سے ہجرت کر کے دہلی تشریف لائے، اپنا مسکن بنایا۔ یہ خاندان ایک تجارت پیشہ خاندان رہا مگر بعد میں چل کر خیرالدین ابوالخیرہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے آبائی پیشے سے انحراف کرتے ہوئے میدانِ علم وعمل کو اختیار فرمایا۔ یہ اپنے وقت کے جید عالمِ دین تھے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب "فتاویٰ عالم گیری" کے مرتبین میں سے ہیں اور یہیں سے اس خاندان میں علم وعرفان کے نورانی سلسلے کی ابتدا ہوتی ہے۔ مفتی صاحب کے والد ماجد مولوی لطف اللہ کشمیری ہیں، دہلی کے نام ور علماے کرام میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شرافت ونجابت کے لحاظ سے بھی یہ خاندان ہمیشہ نمایاں رہا، بزرگی وخیر خواہی اس کی علامت رہی۔

تعلیم و تربیت: مفتی صاحب کی پیدائش ایک ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جو علم وعرفان کی خوشبو سے معطر تھا اور آپ کی پرورش و پرداخت خالص علمی وروحانی فضا میں ہوئی۔ آپ بچپن ہی سے نہایت شریف اور ذہین وفطین تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مولوی لطف اللہ کشمیری سے حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے خاندان ولی اللہ کے چشم وچراغ کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ چوں کہ پورے ملک میں انھیں کے درس گاہ کی شہرت تھی۔ ہر طرف سے طالبانِ علوم اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے حاضر ہو رہے تھے۔ آپ نے بھی عربی ادب، علم معانی وبیان، فقہ واصولِ فقہ، علمِ کلام اور تفسیر وغیرہ میں حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی (1239ھ/1824ء) سے اکتسابِ علم کیا۔ علمِ حدیث واصولِ حدیث، علمِ رجال وسیر شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ سے اور منطق و فلسفہ، ریاضیات واقلیدس وغیرہ کی تعلیم مولانا فضل امام خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1240ھ/1824ء) سے حاصل کیا۔

منصب صدر الصدور: خاندانِ ولی اللہ کے مذکورہ چشم وچراغ نے آپ کو میدانِ علم وفن کا شہ سوار بنا دیا۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کو آپ کی شرافت وذہانت کی وجہ سے بڑی الفت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ فراغتِ تحصیلِ علم کے بعد ملازمت کے لیے کلکتہ جانے لگے تو انھوں نے ازراہِ شفقت وہاں کے مہتمم مولانا امین الدین کے نام مکتوب ارسال فرمایا، جس میں آپ کے علم وشخصیت کا ذکر تھا۔ کچھ ہی دنوں میں مفتی صاحب کے علم وفضل کا شہرہ پورے ملک میں ہو گیا اور وقت کے بڑے بڑے علما آپ کی صلاحیتوں کے معترف نظر آنے لگے۔ بالآخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انگریز بھی آپ کے علمی جاہ وجلال کے قائل ہو گئے اور آپ کی سیاسی فکر وبصیرت کے پیشِ نظر آپ کو صدر الصدور کے عظیم منصب پر فائز کر دیا جو اس وقت کا عظیم ترین عہدہ تھا (یعنی موجودہ دور میں چیف جسٹس کا عہدہ)، پھر آپ ایک لمبے عرصے تک برٹش حکومت میں اس عظیم منصب پر فائز رہے، جو آپ کے سیاسی تدبر اور علم وحکمت کا زندہ ثبوت ہے۔

چناں چہ آپ کے شاگرد نواب صدیق خاں بھوپالی رقم طراز ہیں:

"مفتی صاحب کو انگریزی حکومت نے 1240ھ مطابق 1827ء کے قریب صدر الصدور اور مفتی دہلی مقرر کیا اور اس حیثیت سے وہ مغربی بلکہ مشرقی شمالی دہلی میں فتاویٰ دیتے تھے اور امتحان مدارس وصدارت اور حکومت دیوانی بھی

rahbarmisbahi@yahoo.co.in

ان کے سپرد تھی۔ تیس سال تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔"

(اتحاف النبلاء بحوالہ جنگ آزادی اور وطن کے جاں باز، ص:12)

مگر بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً مفتی صاحب کو صدر امین بنایا گیا اور بعد میں ترقی دے کر صدر الصدور کر دیا گیا چناں چہ آگرہ گزٹ انگریزی 1844ء، ص: 198 میں ہے کہ 15رجون 1844ء کو دلی میں صدر الصدور بنایا گیا۔

(بحوالہ جنگ آزادی اور وطن کے جاں باز، ص:12)

سیاسی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی میں آپ یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ چند ہی دنوں میں آپ کے عدل وانصاف کے پھریرے پورے ملک میں لہرانے لگے۔ مقدمات کے سلسلے میں آپ کے غیر جانب دار رویہ نے عدل وانصاف کی دنیا میں نئی تاریخ رقم کر دی۔ نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں:

"مفتی صاحب نے جس فرض شناسی، ذمہ داری اور دیانت داری کے ساتھ انجام دیا اس کی داد نہ صرف انگریزی حکومت کے اعلیٰ افسروں نے دی بلکہ عوام وخواص رعایا میں بھی اس کے چرچے رہے۔"

(مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، ص:22)

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بقول:

"جھگڑوں کا فیصلہ کرنے پر معمور ہیں جو منصب اعلیٰ ہے جس کو اہل فرنگ کی اصطلاح میں صدر الصدور کہتے ہیں، فی زمانہ ان کی حکومت میں اہلِ ہند کے لیے اس سے بڑا عہدہ نہیں ہے۔ مولانا نے اس دنیوی کسب معاش کے ذریعہ کو دینی ثواب حاصل کرنے کا وسیلہ بنا رکھا ہے، کیوں کہ ان کی تمام تر کوششیں مخلوق کی حاجت روائی میں صرف ہوتی ہیں۔ ان کے انصاف کی برکت ہر خاص وعام پر محیط ہے۔"

(مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، ص:22)

انقلاب 1857ء میں مفتی صاحب کا کردار: انقلاب 1857ء میں مفتی آزردہ دہلوی کی خدمات بڑی اہمیت کی حامل ہیں، اگرچہ انھوں نے اپنے منصب اور کچھ دیگر سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے کھل کر اس میں حصہ نہ لیا۔ مگر سر بہ کف مجاہدین کی رگوں میں حریت کی روح پھونکنے میں ان کا اہم رول ہے۔ عدالتی کاروبار سے فرصت ملتے ہی آپ سلطان بہادر شاہ ظفر کے دربار میں حاضر ہو جاتے، پھر جہاد کے سلسلے میں باہمی گفت وشنید میں مشغول رہتے۔ چناں چہ جب دہلی میں مجاہدین کی آمد کی اطلاع ملی تو مجلس برخاست کر کے بجائے انگریزوں کی صف میں شامل ہونے کے 19ررمضان المبارک مطابق 12رمئی 1857ء کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شامل ہوئے۔

(کنز التاریخ، ص:307 بہ حوالہ: مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، ص:73)

مفتی صاحب خود اپنے گھر پر بھی موقع بہ موقع انقلابیوں کی ہدایت ورہ نمائی کا کام انجام دیتے تھے۔ ہمہ وقت مجاہدین کی آمد کا سلسلہ آپ کے گھر پر جاری رہتا تھا۔ عبدالرحمٰن پرواز رقم طراز ہیں:

"انگریزوں کے سب سے خطرناک دشمن جن کو مجاہدین کہا جاتا تھا، جن کی انگریز دشمنی کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری کی بنا پر نہیں تھی، بلکہ حریت پسندی نے اس کو عقیدے کی حیثیت دے رکھی تھی۔ ان سر بہ کف مجاہدین کا ہجوم جس کے در دولت پر رہتا تھا، وہ مفتی صدرالدین صدر الصدور ہی تھے۔"

چناں چہ 9راگست 1857ء کا واقعہ ہے کہ کسی غلط فہمی کی بنا پر پچاس سپاہیوں کا ایک دستہ حضرت مفتی صاحب کے گھر پر چڑھ دوڑا، اس پر منشی جیون لال کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

"یہ دیکھ کر کہ وہاں ستر جہادی مقابلے کے لیے تیار ہیں وہ واپس آ گیا۔" (روز نامچہ منشی جیون لال، ص:212 بحوالہ مفتی صدرالدین آزردہ، ص:74)

علامہ فضل حق خیر آبادی نے انگریزوں کے خلاف جامع مسجد دہلی سے جو فتویٰ جہاد جاری کیا تھا اس پر سرِ فہرست آپ کا بھی دستخط تھا۔ جنگ آزادی میں مفتی صاحب کی گراں قدر خدمات مولانا محمد میاں کی اس عبارت سے بھی اجاگر ہوتی ہے:

"1857ء سے تقریباً دس سال پہلے کی بات ہے کہ انقلابیوں کے قافلہ سالار دلاور جنگ، احمد اللہ شاہ مدراسی جب اپنی انقلابی مہم لے کر دہلی تشریف لائے تو یہی وہ فرزانہ روز گار مفتی صدرالدین صاحب تھے جنھوں نے شاہ صاحب موصوف کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی جد وجہد کا مرکز دہلی کے بجائے آگرہ بنائیں، پھر آپ ہی نے خط کے ذریعہ شاہ صاحب کا تعارف آگرہ کے ان علما سے کرایا جو ایک طرف سرکاری حلقوں میں باوقار تھے تو دوسری طرف قومی اور علمی کارکنوں کا اعتماد بھی ان کو حاصل تھا۔ جنوبی ہند کا ایک غیر معروف نوجوان جو دہلی میں ناکام ہو چکا تھا، اس نے اس دورِ بے آئین میں جو سیاسی لحاظ

سے بہت ہی نازک تھا، پولس اور سی آئی ڈی کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہتے ہوئے چند مہینوں میں وہ غیر معمولی حیثیت حاصل کر لی جس کی نظیر بہت ہی مشکل سے کہیں ملتی ہے۔ یہ بے شک حضرت شاہ صاحب کی معمولی صلاحیت و قابلیت کی برکت ہے، لیکن ایک منصف مزاج اور حقیقت پسند کو اس پر تامل نہ ہونا چاہیے کہ حضرت مفتی صاحب کے تعارفی خط نے بھی اساس و بنیاد کا کام کیا ہے۔ دار الحکومت آگرہ کے اعلیٰ سیاسی طبقہ میں ایک غیر معروف شخص کے لیے رسوخ اور اعتماد حاصل کرنے کی کٹھن منزل جو سال ہا سال میں طے ہوتی حضرت مفتی صاحب کا مکتوب گرامی اور سیاسی طبقہ سے مفتی صاحب کا گہرا تعلق بھی تھا جس نے ان کو نہایت آسانی سے چند لمحوں میں طے کر دیا۔" (علماے ہند کا شان دار ماضی، ج4، ص:265)

علامہ سید محمد ہاشمی میاں مفتی صاحب کی ان سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"انگریزوں کا اقتدار بڑھتا دیکھا تو تحریکِ آزادی کا جھنڈا اٹھایا اور فتویٰ جہاد نشر کیا۔ مجاہدین واکابرین تحریک آزادی کی سیاست کی تمام جائدادیں تحریک پر ختم کر دیں۔"

(ماہ نامہ قاری، امام احمد رضا نمبر، ص:398 از علامہ سید محمد ہاشمی)

حقیقت کا خون: ہر دور میں کچھ ایسے ضمیر فروش اہل قلم جنم لیتے رہے ہیں جن کا شیوۂ زندگی سچائی کا خون کرنا ہوتا ہے اور تاریخ کا پانسہ پلٹ کر غیروں کے کارناموں کو اپنے نام کرنے کے وہ عادی ہوتے ہیں۔ انقلاب 1857ء کی تاریخ مرتب کرنے والے مورخوں میں سے بھی کچھ لوگوں کا رشتہ اسی گروہ سے ہے۔

مفتی آزردہ دہلوی کا رشتہ اہل سنت و جماعت سے ہونے کی وجہ سے جنگ آزادی میں ان کی زریں خدمات کو مشکوک کرنے کی ناپاک جسارت کی گئی اور یہ کہا گیا کہ علامہ فضل حق خیر آبادی کے فتویٰ جہاد پر مفتی صاحب کا اصلی دستخط نہیں تھا یا پھر ان سے جنرل بخت خاں نے جبراً دستخط لیا تھا، جو ان کی مرضی کے خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے دستخط کے نیچے "بالجبر" لکھ دیا تھا۔ جیسا کہ خان بہادر ذکاء اللہ مفتی صاحب کے دستخط کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"جنرل بخت نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتویٰ پر دستخط و مہر کرالیں اور مفتی صدر الدین نے بھی ان کے جبر سے اپنی جعلی مہر کر دی۔"

(مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، ص:80)

یوں ہی فضل حسین بہاری نے بھی "الحیات بعد الممات" میں ص:76 پر یہی لکھا ہے:

"حالاں کہ ان باتوں کا حقیقت و سچائی سے کوئی علاقہ نہیں ہے، کیوں کہ اس فتویٰ جہاد کی نقل اخبار الظفر دہلی میں شائع ہوئی تھی، مورخہ 20/جولائی 1857ء کو صادق الاخبار دہلی میں بھی اس کی نقل شائع ہوئی تھی۔ آج بھی یہ اخبار نیشنل آرکائیوز دہلی میں محفوظ ہے۔" (ماہ نامہ جام نور، دہلی، ص:48)

انقلاب کے دوران مفتی صاحب لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر کے پاس آتے جاتے رہے اور انقلابی مجاہدین بھی آپ سے ہدایت حاصل کرنے آپ کے گھر آتے جاتے رہے۔ (روزنامچہ منشی جیون لال)

مفتی صاحب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر وہ فتویٰ جہاد کے حق میں تھے تو پھر ان کو دیگر مجاہدین کی طرح قید دوام، کالا پانی اور سزائے موت وغیرہ کیوں نہیں دی گئی۔ جب کہ فتویٰ جہاد پر دستخط کی پاداش میں دیگر مجاہدین کی طرح مفتی صاحب کو بھی انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ بننا پڑا، مصیبتیں جھیلنی پڑیں، آپ کی تمام جائداد و املاک ضبط کر لی گئی، روزگار بھی ہاتھ سے چلا گیا، حوالات میں بند رہے، مقدمہ چلا، پھر بعد میں رہائی ملی۔

(اتحاف النبلاء، ص:261)

مفتی صاحب کی لائبریری جس میں تقریباً تین لاکھ کتابیں تھیں، تباہ و برباد کر دی گئی اور محض کوڑی کے داموں میں فروخت کر دی گئی۔ (مفتی صدر الدین آزردہ، ص:82، از: پرواز اصلاحی)

یہی نہیں، دہلی پر انگریزوں کا غلبہ اپنے ساتھ تباہی و بربادی کا جو طوفان لایا اس کے شکار مفتی صاحب کے قریبی رشتہ دار اور احباب بھی ہوئے۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ و مولانا امام بخش صہبائی جوان کے محبِ خاص میں سے تھے وہ بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ مولانا امام بخش صہبائی کو ان کے کنبہ سمیت صف میں کھڑا کر کے گولیوں سے بھون دیا گیا۔ جب مولانا صہبائی کی شہادت کی خبر آپ کو ملی تو آپ نے ایک نظم قلم بند کی جس کا مقطع یہ ہے:

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

(نیا دور انقلاب 1857ء نمبر، ص:228)

مفتی صاحب کی چند اہم خدمات: انقلاب 1857ء کی ناکامی کے بعد جب دہلی پر برٹش حکومت پوری طرح قائم ہوگئی تو انگریزوں نے جامع مسجد دہلی پر قبضہ کر کے اصطبل بنا دیا۔ چوں کہ یہیں سے فتویٰ جہاد نشر کیا گیا تھا، پھر انگریزی فوج کے ساتھ جامع مسجد کے دروازے پر انقلابیوں کے درمیان سخت معرکہ آرائی ہوئی تھی اور فوج کو پسپائی ہوئی تھی۔ پانچ سال تک مسجد ان کے زیر قبضہ رہی، اس میں سکھوں کا لشکر بھی قیام پذیر رہا، جو بول و براز سے بھی پرہیز نہ کرتے تھے۔ مفتی صاحب دہلی کے عمائدین شہر سے مل کر جولائی 1862ء میں مسجد کی بازیابی کی تحریک لے کر اٹھے بالآخر کافی دوڑ بھاگ کے بعد نومبر 1863ء میں آپ کی محنتِ شاقہ رنگ لائی اور انگریزوں نے مسجد کو آزاد کر دیا، پھر اس کی نگرانی کے لیے دس آدمیوں پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی گئی۔ (غدر کے چند علما، ص:48)

مدرسہ دار البقا دہلی جس کو شاہ جہاں نے تعمیر کرایا تھا، گردشِ ایام کی نذر ہو کر ویران ہو گیا تھا، اس کی عمارت نہایت ہی خستہ ہوگئی تھی مفتی صاحب نے اپنے خرچ سے از سر نو تعمیر کروایا اور اس میں تعلیم و تعلم کا دوبارہ نظم و نسق قائم کیا۔

(آثار الصنادید، ص:282، بحوالہ مفتی صدر الدین آزردہ، ص:31)

مفتی صاحب کافی مصروف رہا کرتے تھے۔ عدالت وافتا کی ذمہ داری کے علاوہ مرحوم کالج دہلی سمیت کئی کمیٹیوں کے رکن اور عربی و فارسی کے ممتحن بھی تھے۔ ان سب کاموں سے فرصت ملتے ہی درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے پھر ادبی مجلسوں اور مشاعروں میں بھی شرکت کرتے، اس لیے تصنیف و تالیف کے لیے آپ کو زیادہ وقت میسر نہ آسکا، ورنہ علم و فن کے اس بحر ذخار سے یہ بعید از قیاس نہیں کہ وہ کتابوں کے انبار لگا دیتے۔ (تذکرہ علماے ہند، از: رحمٰن علی، ص:153، مطبوعہ حیدر آباد)

وصال: آخری عمر میں مفتی صاحب پر فالج کا اثر ہو گیا اور وہ دو سال تک اس کے شکار رہے، بالآخر 81/برس کی عمر میں پنج شنبہ 24/ربیع الاول 1285ھ کو دنیائے فانی کو الوداع کہہ گئے۔

شمس الشعرا مولوی ظہور علی کے اس شعر سے آپ کا سنِ وصال نکلتا ہے:

چراغش ہست تاریخ ولادت
کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود

یعنی ان کی تاریخ ولادت چراغ تھی اور تاریخ وفات "چراغ دو جہاں" نکالی۔ (تذکرہ علماے ہند، از رحمٰن علی، مطبوعہ حیدر آباد، ص:154)

......(ص:86 کا بقیہ)......

سفر حرمین شریفین اور شہادت:

زیارت حرمین شریفین کی تمنا حضرت مفتی صاحب کے دل میں ایک عرصے سے موج زن تھی، جس کا اظہار آپ نے تواریخ حبیب الٰہ کے آخر میں یوں کیا ہے:

"الحمد للہ یہ رسالہ تمام ہوا، خداے تعالیٰ قبول فرماوے اور بہ طفیل اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے مولف گناہ گار کا خاتمہ بہ خیر کر کے اپنے حبیب کی شفاعت نصیب کرے اور مکارہ دنیوی سے جلد نجات دے کے اپنے اور اپنے حبیب کے آستانہ پر پہنچادے۔" (تواریخ حبیب الٰہ، ص:183، مطبع قیومی، کانپور)

مفتی صاحب کی دلی خواہش 1279ھ/1862ء میں پوری ہوئی۔ صاحب تذکرۂ مشاہیر کاکوری لکھتے ہیں:

"دو سال کان پور میں قیام کے بعد 1279ھ/1862ء میں سفر حج کا ارادہ فرمایا تو مولانا سید حسین شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو مدرس اول، مولانا لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو مدرس ثانی مقرر فرمایا۔ کاکوری آئے اور اپنی تمام اولاد کو حضرت مولانا شاہ تقی علی قلندر (ولادت 1213ھ/1797ء، وفات 1290ھ/1874ء) خانقاہ کاظمیہ (کاکوری) کا مرید کرایا اور کہا، ان شاء اللہ واپسی پر میں بھی حضرت سے بیعت ہو جاؤں گا۔ آپ نے اسی وقت کشف صحیح سے فرمایا کہ واپسی تو ہو چکی۔ مفتی صاحب اہل وعیال سے رخصت ہو کر روانہ ہوئے۔ جب جدہ کے قریب پہنچے تو جہاز پہاڑ سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مفتی صاحب نے بھی بہ حالتِ نماز احرام باندھے ہوئے 17/شوال 1279ھ/1863ء کو بہ عمر 52 سال غرق ہو کر جامِ شہادت نوش فرمایا۔" (کواکب، ص:204)

اس سفر میں کتاب "لوامع العلوم و اسرار العلوم" حضرت مفتی صاحب کے ساتھ غرقاب ہوئی۔ جس کی تفصیل کتاب کے تعارف میں بیان کر دی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

تحریک آزادی کے عظیم مجاہد

مولانا لیاقت علی الہ آبادی

شکیل احمد مصباحی

انقلاب 1857ء نے ہندوستانی اقوام کو اس درجہ متاثر کیا تھا کہ بعد میں آنے والی ہر تحریک کا رشتہ اس سے کسی نہ کسی طور پر جڑا نظر آتا ہے۔ اس جنگ آزادی میں انقلابی فوجیوں کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار، ادیب، شعرا، علما سب شریک تھے بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ علماء کی جماعت نے زیادہ دلچسپی دکھائی تھی اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے ملت اسلامیہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا تھا۔ اس زمانے میں علما صرف دینی اور علمی خدمات تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ حسب ضرورت قومی و وطنی امور کی انجام دہی بھی مہارت وخلوص کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف سب سے زیادہ موثر کارنامے انہیں کی جانب سے وجود میں آئے اور یہ بھی سچائی ہے کہ انقلاب ومزاحمت کی ناکامیوں کے بعد عام مسلمانوں کے ساتھ علما کی جماعت ہی سب سے زیادہ قتل وسزا سے ہم کنار ہوئی۔

انگریزی تسلط اور بے جا ظلم کے خلاف مختلف شہروں میں محاذ جنگ قائم ہو چکا تھا، ہر جگہ کے لوگ انگریزی افواج کو ناپسند کرنے لگے تھے اور یہ دائرہ دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض ملت فروش اور وطن دشمن عناصر ایسے نازک موقع پر بھی انگریزوں کے حمایتی بنے ہوئے تھے چناں چہ تحریک آزادی میں دیگر علاقوں کی طرح الہ باد کا بھی اہم رول رہا ہے۔ ہندوستان کی پہلی منظم جنگ آزادی 1857ء میں عظیم مجاہد آزادی مولانا لیاقت علی کا نام انتہائی نمایاں نظر آتا ہے۔ الہ آباد شہر سے تقریبا 15 / میل دور جانب مغرب جی۔ٹی۔ روڈ کے کنارے پرگنا چائل کے موضع مہگاؤں میں 5 / اکتوبر 1817ء کو ایک زمین دار گھرانے میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ کے والد قاضی میر علی علاقے کے با اثر شخص تھے۔ آگے چل کر آپ نے انگریزوں کے خلاف پورے جوش وخروش سے حصہ لیا جس کی وجہ سے آپ باغی گردانے گئے۔ 1857ء میں جب انگریزوں کے خلاف شورش پیدا ہوئی اور میرٹھ چھاونی سے اٹھنے والی بغاوت کی تحریک ملک کے دیگر حصوں میں بھی پہنچ گئی تو 6 / جون 1857ء کو مولانا لیاقت علی کو شہنشاہ کی طرف سے الہ آباد صوبے کا صوبے دار بنا دیا گیا۔ اس عہدے کو آپ نے بحسن وخوبی اور پوری ذمہ داری کے ساتھ نبھایا۔ ہم وطنوں کے ساتھ جنگ آزادی میں خود بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور لوگوں کو بھی خوب ترغیب دلائی جس کے نتیجے میں ہندو مسلم سبھی لوگ انگریزی استبداد کے خلاف جان ودل سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مولانا لیاقت علی کے تعلق سے پنڈت سندر لال لکھتے ہیں ... بغاوت کے چند دنوں بعد ہی شہر کے باشندوں اور آس پاس کے زمین داروں نے ایک صوفی مولوی لیاقت علی کو شہنشاہ کی جانب سے الہ آباد صوبے کا صوبے دار مقرر کر دیا۔ وہ نہایت ایماندار اور غیر معمولی صلاحیت کے حامل تھے۔ سبھی ان کی بے حد عزت کرتے تھے انہوں نے خسرو باغ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور اپنے علاقے میں امن وامان بحال کر دیا۔ وہ برابر یہاں کے بارے میں شہنشاہ کو رپورٹ بھیجتے رہے۔ انہوں نے قلعہ پر قبضہ تک کر لینے کی کوشش کی اور قلعہ میں موجود سپاہیوں سے باہر نکل کر باغیوں کا ساتھ دینے کی اپیل کی لیکن ان لوگوں نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا اسی کے بعد انگریزوں نے ظلم ڈھانا شروع کر دیا۔ مہگاؤں میں مولانا لیاقت علی کی آبائی حویلی تھی جسے انگریزوں نے بغاوت کی ناکامی کے بعد نیست ونابود کر دیا اس کوٹھی میں اسلحوں کا کافی ذخیرہ تھا اور اس کوٹھی سے خسرو باغ کے لئے ایک سرنگ تھی۔ اسلحوں اور سرنگ کی تلاش میں انگریزوں نے کوٹھی کی ایک ایک اینٹ کھدوا ڈالی۔

مولانا لیاقت علی کچھ دنوں تک انگریزی فوج میں ملازم رہے تھے۔ لیکن وطن کی آزادی کے لئے ان کا ضمیر باوفا تھا۔ لہذا وہ انگریزوں کے خلاف اپنے ہم وطنوں کو نفرت دلانے لگے اس وجہ سے فوج سے باہر کر دئے گئے اس کے بعد وہ اپنے گاؤں میں امامت کے فرائض انجام دینے اور نونہالوں کی تعلیم وترتیب کی طرف راغب ہو گئے۔ آپ ایک غیرت مند محب وطن اور دین دار عالم دین تھے۔ اسی درمیان جب انگریزوں کے خلاف ہر طرف سے نفرت وبیزاری بڑھنے لگی اور میرٹھ سے اٹھنے والی بغاوت کی لہر مرادآباد پہونچی تو یہاں بھی بغاوت کے شعلے لپک اٹھے اور ہندو مسلمان جو کہ مولانا کے بے حد معتقد تھے سب ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ آپ کی اپیل پر صمد آباد، دارا گنج اور چھیت پور وغیرہ گاؤں کے لوگ انگریزوں کے خلاف جوش وجذبہ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ 7 / جون کو مجاہدوں نے سبز پرچم کے ساتھ جلوس نکالا اور کوتوالی پہونچ کر وہاں اپنا پرچم لہرا دیا اور خزانے کا 30 / لاکھ روپیہ اپنی تحویل میں لے لیا۔ مولانا لیاقت علی نے انگریزوں کے خلاف جد وجہد کے لئے خسرو باغ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنانے کے بعد سے 10 / جون تک پوری جرأت وجواں مردی کے ساتھ اپنا قبضہ قائم رکھا۔ اس درمیان قلعہ پر قبضے کی بھی کوشش کی جب کہ ان کے سامنے انگریزوں سے مقابلہ کرنے میں بے شمار رکاوٹیں اور پریشانیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں دوسری طرف انگریزی فوج 7 / جون ہی سے الہ آباد پر قبضے کے لیے نقل حمل میں مشغول تھی، 12 / جون کو کرنل نیل کی قیادت میں انگریزوں نے دارا گنج میں مولانا لیاقت علی سے مقابلہ کے بعد قبضہ بحال کر لیا پھر 14 / جون کو ایک اور معرکہ ہوا جس میں انگریزوں کو منہ کی کھانی پڑی اور وہ خوف زدہ ہو کر قلعہ بند ہو گئے۔ اس فتح سے آپ کے فوجیوں کے ٹوٹے ہوئے حوصلے بلند ہو گئے مگر 16 / جون کو مزید کمک آنے کو بعد لیفٹیننٹ کرنل نیل نے خسرو باغ پر اپنی پوری طاقت صرف کر دی۔ پورے دن گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی اور آخر کار انگریزوں کو کامیابی مل گئی۔ فتح کے نشے میں چور انگریزوں نے قتل عام کا بازار گرم کر دیا اور خون کی سرخی سے خسرو باغ کے در ودیوار کو پوری طرح رنگ دیا۔ دریا آباد، شادی آباد اور رسول پور کے مسلمانوں کو بھی انگریزوں نے خوب مشق ستم بنایا اور الہ آباد قلعہ کے مغربی کنارے پر واقع جامع مسجد کو شہید کر کے اسے فوجی بیرک بنا دیا مجاہدین پر اس قدر ظلم ڈھائے کہ تاریخ جنگ کے صفحات بھی ماتم کناں ہیں۔ خود انگریز مورخین کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ چوک میں واقع نیم کے درخت پر بے شمار لوگوں کو پھانسی دے دی گئی اور بہت سی جگہوں پر پھانسی کی زحمت سے بچنے کے لیے پورے کے پورے گاؤں کو ہی نذر آتش کر دیا گیا۔ جان بچانے کے لیے جب وہاں کے باشندے بھاگتے تو انہیں گولیوں کا نشانا بنا دیا جاتا اس طرح سے آزادی کی اس لڑائی میں بہت سے لوگ موت کی نیند سو گئے۔

اسی طرح وہ دوسرے گاؤں کے باشندے جو مولانا لیاقت علی کی اپیل پر جنگ آزادی میں پیش پیش تھے ناکامی کے بعد انگریزی موت کی بھٹی میں ابدی نیند سو گئے۔ چھیت پور، دارا گنج، رسول پور، صمد آباد، کسیا، سرائے میر منہاج پور، روہی، شیخ پورہ وغیرہ کے رہنے والے انگریزوں کے ظلم وستم کے نشانا بنے۔ اس ناکامی کے بعد مولانا صاحب اپنے وفاداروں کے ساتھ دوسرے مقام پر چلے گئے اور حکمت عملی کے تحت نام اور حلیہ بدل بدل کر لوگوں کو انگریزوں کے خلاف منظم کرنے لگے، انگریزوں نے آپ کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر 5000 / روپے نقد انعام کا اعلان کر دیا تھا اور اس اعلان کے اشتہارات جگہ جگہ آویزاں کر دئے تھے تا کہ آپ جلد از جلد گرفتار ہو جائیں اور انگریز اپنی جابرانہ حکمرانی کی توسیع کر سکیں۔ بالآخر 1872ء میں ممبئی میں جب آپ ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے جا رہے تھے ایک انگریز افسر اسٹیل کے ہاتھوں گرفتار کر لیے گئے۔ پھر ان پر بغاوت کا مقدمہ چلا شنوائی کے درمیان انگریز جج نے کہا کہ مولوی صاحب ایک عالم ہیں لہذا اگر وہ اپنے کیے پر افسوس کر لیں، آئندہ سیاست سے الگ رہنے کا وعدہ کریں اور اپنے گاؤں جا کر پہلے کی طرح بچوں کو پڑھانے کا کام انجام دینے لگیں تو انہیں معافی دی جا سکتی ہے۔ مگر آپ نے اس پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے علی الاعلان یہ قبول کیا کہ انہوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی سربراہی کی تھی اور جہاد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور انہیں اس پر کوئی افسوس نہیں۔ انگریز جج نے اس عظیم مجاہد آزادی کو کالا پانی کی سزا دے کر جزیرۂ انڈمان نیکوبار روانہ کر دیا جہاں 17 / مئی 1892ء کو یہ انقلاب آفریں شخصیت آزادی کا خواب آنکھوں میں بسائے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ مگر دنیا نے ماتھے

کی نگاہوں سے دیکھ لیا کہ مجاہدین کی قربانیاں رنگ لائیں اور 1947ء میں ان کی جد و جہد اور قربانیوں کا سورج پورے طور پر روشن ہو گیا۔ افسوس صد افسوس کہ آج ہندوستان کی تاریخ آزادی سے مسلم مجاہدین کے نام اور کارنامے دانستہ طور پر نکالے جا رہے ہیں اور عام لوگوں کو یہ پیغام پہونچایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کا جنگ آزادی میں کوئی کارنامہ نہیں یہ ایک ایسا سفید جھوٹ ہے جس پر جی بھر کر ماتم کیا جائے تو بھی کم ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تاریخ کا مطالعہ کریں اور اپنی آنے والی نسلوں کو ان مجاہدین کے کارناموں سے واقف کرائیں اسی میں پوری ملت کی بھلائی ہے۔

جنگ آزادی کے سلسلے میں مولانا لیاقت علی کی ایک جہادیہ نظم بھی ہے، جسے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے ہو کر پڑھتے اور ''دین دین'' کے نعرے لگاتے ہوئے آزادی کی راہ میں لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ ملاحظہ ہو:

بعدِ تحمید خدا نعت رسولِ اکرم
یہ رسالہ ہے جہادیہ کہ لکھتا ہے قلم
واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمعِ بلاد
اہلِ اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
ہے جو قرآن و احادیث میں خوبیِ جہاد
ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا اسے کرلو یاد
فرض ہے تم پہ مسلمانو، جہادِ کفار
اس کا سامان کرو جلد، اگر ہو دیں دار
جو مسلمان رہِ حق میں لڑا لحظہ بھر
روضۂ خلد بریں یا واجب اُس پر
اے برادر، تو حدیثِ نبوی کو سن لے
باغِ فردوس ہے تلوار کے سائے کے تلے
دل سے اِس راہ میں پیسہ کوئی دیوے گا اگر
سات سو اُس کو خدا دیوے گا روزِ محشر
زر بھی گر خرچ کیا اور لگائی تلوار
پھر تو دیوے گا خدا اس کو عوض سات ہزار
جو کہ مال اپنے سے غازی کو بنا دے اسباب
اس کو بھی مثل مجاہد کے خدا دے گا ثواب
جو نہ خود جائے لڑائی میں نہ خرچے کچھ مال
اس پہ ڈالے گا خدا پیش تر از مرگ وبال
جو رہِ حق میں ہوئے ٹکڑے، نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں جنت میں خوشی کرتے ہیں
مدت العمر کے مٹتے ہیں گناہِ شہدا
کیوں نہ ہو جنگ میں کٹواتے ہیں سر بہرِ خدا
فتنۂ جز و غمِ صور و قیامِ محشر
ایسے صدموں سے شہیدوں کو نہیں ہے کچھ ڈر
حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثل دیوار جو سر باندھ کے جم جاتے ہیں
اے مسلمانو! سنی تم نے جو خوبیِ جہاد
چلو اب ان کی طرف مت کرو گھر بھر کو یاد
مال و اولاد کی اور گھر کی محبت چھوڑو
راہ مولا میں خوشی ہو کے شتابی دوڑو
گر رہے جیتے تو گھر بار میں پھر آؤ گے
اور گئے مارے تو جنت کو چلے جاؤ گے
دینِ اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے
غلبۂ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے
زورِ شمشیر سے غالب رہا اسلام مدام
سستی اگلے جو کبھی کرتے تو ہوتا گم نام
کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹکاؤ گے
اپنی سستی کا جو افسوس نہ پھل پاؤ گے
اب تو غیرت کرو نامردی کو چھوڑو یارو
ملو چل چل کے امام اپنے کافر مارو
بارہ سو سال کے بعد آئی یہ دولت آگے
حیف اس دولتِ بیدار سے مومن بھاگے
یعنی اسباب لڑائی کا جو کچھ تھا درکار
سب دیا تو نے ہمیں اور کیا پھر سردار
بات ہم کام کی کہتے ہیں، سنو تم یارو
وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ کر مارو

☆☆☆☆☆☆

مولانا وہاج الدین مرادآبادی

عزیز احمد قادری چشتی

شہیدِ ملت فدائے قوم مولانا وہاج الدین عرف مولوی منو رحمۃ اللہ علیہ بن مولوی جمیل الدین ابن مولوی وجیہ الدین ابن مفتی شیر محمد مرادآباد کے ممتاز باثر، قوم پرور اور جلیل القدر رئیس تھے۔ نہایت ہی فیاض، سیر چشم اور مہمان نواز تھے۔ ان کا دستر خوان فراخ، مذہب کے معاملے میں آہنی ستون، عبادت گزار، بے مثل شجاع اخلاق کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ ہر اعلیٰ و ادنیٰ کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ سب سے یکساں ملتے جلتے، ہر ایک کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہتے۔ ضرورت مندوں اور غربا کی دل کھول کر مدد کرتے اور ان کی تقریبوں اور محفلوں میں بغیر کسی بلندی و پستی کے فرق کے شریک رہتے۔ مختصر یہ کہ بہت بڑے جتھے بند اور مقتدر رئیس ابن رئیس تھے۔ لندن سرکار سے خصوصی اعزاز بھی ملا ہوا تھا، شہر کے حکام نہایت احترام کرتے تھے اور ان سے ملنا باعث فخر و ناز سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب کو عربی فارسی اور اردو علوم کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے انگریزی زبان اپنے حقیقی چچا مولانا محمد اسماعیل لندنی کی بیوی سے جو ایک یوروپین مہذب خاندان سے تعلق رکھنے والی لیڈی تھیں، پڑھی تھی۔

مولانا محمد اسماعیل لندنی قریب قریب ہر زبان کے عالم تھے۔ ان کے باپ مولوی وجیہ الدین اور دادا شیر محمد عمائدین شہر میں ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ مولانا محمد اسماعیل اور مولوی جمیل الدین دونوں حقیقی بھائی تھے اور دونوں بھائی اودھ سرکار میں بلند عہدوں پر فائز تھے۔ سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

سرکارِ اودھ کی طرف سے جو علما وقتاً فوقتاً لندن پہنچ گئے، ان میں دو نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: مولوی محمد اسماعیل لندنی اور مولوی محمد حسین لندنی۔ ان دونوں نے یورپ کے جدید علوم و فنون سے اہلِ ملک کو آشنا کیا۔ مولوی محمد اسماعیل لندنی مرادآباد کے رہنے والے تھے جو نواب نصیر الدین حیدر کی طرف سے سفیر لندن بھی مقرر ہوئے۔ منطق کی بعض قدیم کتابوں پر ان کے حاشیے ہیں۔ 1253ھ میں وفات پائی۔ نواب نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ان کے علاوہ دو اور قابلِ ذکر ہیں اور مولوی کمال الدین حیدر لکھنو میں جو یورپین علما رہتے تھے، ان سے برابر ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اس کا نتیجہ وہ رسد خانہ ہے کو جو 1247ھ میں شاہ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں جنرل کلاوڈ کی کوٹھی میں بننا شروع ہوا اور محمد علی شاہ کے زمانے میں بن کر تیار ہوا۔ اس رسد خانے میں کرنل ولکاکس وغیرہ کے علاوہ مولوی عبد الرب صاحب، مولوی کمال الدین صاحب اور مولوی اسماعیل صاحب مرادآبادی شریک تھے۔'' (ماخوذ از نقوشِ سلیمانی، ص:82)

مولانا محمد اسماعیل لندنی کا کوئی نواسہ اور پوتا نہ تھا۔ صرف ایک لڑکی تھی اور ایک نواسی تھی۔ نواسی کا نام شہر بانو تھا، کیوں کہ مولانا کے کوئی مزید اولاد نہ تھی، اس لیے ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بھتیجے مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کو دولتِ انگلشیہ سے خلعت کے ساتھ ساتھ وہ اعزازی چیز عطا کی گئی جو لندن سرکار سے ان کے چچا مولانا محمد اسماعیل لندنی کو ملی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب کوئی انگریز مولوی منو صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے، ان کے دولت کدے پر حاضری دینے آتا تو سلام کے بعد بھی مودب کھڑا رہتا۔ جب مولوی صاحب مذکور اس اعزازی شے کو تن سے جدا کر کے الگ رکھ دیتے تو بیٹھ کر گفتگو کرتا۔ غرض مولوی صاحب شہر کی ناک تھے۔

مولانا وہاج الدین کے یہاں روزانہ شہر کے شرفا اور اہلِ علم جمع ہوا کرتے تھے۔ ان کا حلقۂ احباب ذی علم لوگوں سے پر تھا، جن میں سے چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔ مولانا سید کفایت علی کافی، مولوی سرفراز علی، سید اکبر علی، سید گلزار علی اور مولوی وزیر علی۔

1857ء کی جنگ آزادی میں مولوی وہاج الدین عرف منو نے ایک قائد کی حیثیت سے انتہائی سرگرمی سے کام کیا اور متعلقہ

اسکیم کے تحت پارٹیاں قائم کرنے کے لیے پوشیدہ طور پر بذات خود اور نمائندوں کے ذریعہ سربرآوردہ لوگوں کو حصولِ آزادی کی اس تحریک میں شرکت کی دعوت دیتے رہے۔ چند رؤسا ان کو اس کار خیر میں پیش پیش دیکھ کر ان کے ساتھ ہو گئے اور اس طرح ایک بڑی جماعت وجود میں آگئی۔ لیکن نواب فجو خاں جو شہر کے ایک بڑے رئیس تھے، آخری وقت تک تحریک میں شامل نہ ہوئے۔ اس وقت شہر کا جوائنٹ مجسٹریٹ جے جے کمیل تھا۔ مسٹر جان کرافٹ ولسن جج تھے۔ لارسی بی ساانڈرس کلکٹر تھا۔ حکمراں طبقہ ضلع مرادآباد کے لوگوں کے خیالات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ انگریزی حکومت کے حالات روز بروز زبوں ہوتے جا رہے تھے۔ 11/ مئی 1857ء کو جب مجسٹریٹ مسٹر سی بی ساانڈرس کو میرٹھ چھاؤنی کی ہندستانی فوج کے باغی ہو جانے کی اطلاع ملی تو اس کے چھکے چھوٹ گئے اور انگریز عہدے داران دانتوں تلے انگلی دبا گئے۔ کلکٹر نے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے ضلع کا انتظام مسٹر جان کرافٹ ولسن (جو ایک معمر اور نہایت مستقل مزاج انگریز تھا) کے سپرد کر دیا اور یورپین عورتوں کو نواب فجوں خاں کی پناہ میں اس لیے دے دیا کہ وہ اس تحریک سے علاحدہ تھے اور خود مع اپنے ساتھیوں کے نینی تال کی جانب فرار ہو گیا۔

19/ مئی 1857ء کو مولوی وہاج الدین عرف منو کی قیادت میں ضبط و نظم کے ساتھ حریت نوازوں کا ایک جمِ غفیر جیل خانہ کی طرف گیا۔ ہجوم نے مولوی منو صاحب کا اشارہ پاتے ہی جیل خانہ پاش پاش کر دیا۔ قائد نے سب سے پہلے پرچمِ محمدی لہرایا اور تمام قیدیوں کو آزاد کر کے ان کے خورد و نوش اور دیگر اہم ضروریات کا انتظام کیا۔ بعد ازاں ان کی حسبِ خواہش جس نے اس جماعت میں شامل ہونا چاہا، شامل کیا اور باقی لوگوں کو زادِ راہ دے کر خدا حافظ کہہ دیا۔ قائد نے شامل ہونے والے نئے لوگوں کا ایک جتھا بنا کر سید اکبر علی اور سید گلزار علی کی سپردگی میں اودھ کی سمت روانہ کر دیا۔ اس دوران جان کرافٹ ولسن حریت نوازوں کے مارچ کی خبر پاتے ہی روپوش ہو گیا۔

مرادآباد کے جیل خانے کے ٹوٹنے کی خبر روہیل کھنڈ میں پھیلتے ہی عہدے داروں کا سارا رعب و دبدبہ بخ بستہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کی جس قدر بھی دہشت عوام کے دلوں پر طاری تھی یکسر غائب ہو گئی۔ روہیل کھنڈ کے صدر مقام بانس بریلی میں حافظ الملک نواب حافظ رحمت خان کے پوتے نواب خاں بہادر خاں حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے۔

مرادآباد سے ایک وفد قصبہ اور بریلی بھیجا گیا۔ وفد کے صدر مولوی کفایت علی کافی تھے، جنھوں نے اپنے فرائض انتہائی خوش اسلوبی، جواں مردی، شجاعت اور دانش مندی سے سرانجام دیے اور مرادآباد تشریف لے آئے۔

ریاست رام پور کی سرد فضاؤں میں بھی حرارت آچکی تھی۔ لیکن انقلاب کی مکمل تیاریوں کے لیے وہاں جانا امرِ محال تھا۔ ایسے میں کس کی ہمت تھی جو خود کو جان بوجھ کر آگ کے کنویں میں جھونکتا۔ مگر فدائے قوم مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو ہی کی یہ قوم پروری و حب الوطنی اور شجاعت تھی کہ سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنے چند ساتھیوں میں جلسے کرتے، پمفلٹ پڑھ کر سناتے اور اس طرح اپنے وطن کے سپوتوں کو بیدار کر کے جنگ آزادی کی تحریک میں شمولیت کی دعوت دیتے۔

مرزا ناظم بخت کے بیٹے اور فرخ سیر بادشاہ کے نواسے شہزادہ فیروز شاہ کا جب ورودِ مرادآباد ہوا تو شہر کے خواص و عوام سب ہی شان دار طریقے پر استقبالی ہوئے۔ مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو فیروز شاہ کے دست راست تھے۔ مولوی صاحب مذکور اور دیگر رؤسائے شہر اس کی ہر قسم کی معاونت کرتے رہے۔ شہزادہ فیروز شاہ نے شہر کا گشت کیا اور فرداً فرداً ان رؤسا کے یہاں بھی گیا جو جنگ آزادی میں شریک نہ تھے اور اپنے دروازے مقفل کر چکے تھے۔ بالآخر فیروز شاہ نے نواب فجو خاں کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا لیکن ہر دستک اور صدا کا جواب مکمل سکوت ہی رہا اور دیگر رؤسائے شہر کی طرح فجو خاں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ شاہ زادہ مایوس ہو کر ان کے در پر یہ الفاظ کہہ کر واپس ہو گیا:

> ”نہ کھلواؤ دروازہ۔ مگر یاد رہے چچا کہ تم ایسی موت مارے جاؤ گے کہ لوگ عبرت حاصل کریں گے۔ ہم تو جاتے ہیں۔“

مرادآباد میں فیروز شاہ اور اس کی ہم راہ فوج کا پڑاؤ اس باغ میں ہوا تھا، جس باغ کی کوٹھی میں کبھی ننوں والا صاحب رہتا تھا۔ مقام مذکور اس سڑک پر واقع ہے جو سڑک گل شہید کے برف خانے کے نکڑ سے بڑے اسٹیشن کو جاتی تھی۔

ریاست رام پور کے نواب نے قوم سے غداری کی اور انگریزوں کی

ہر ممکن اور ہر طرح سے مدد کی۔ انگریزوں نے موقع غنیمت جان کر پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انگریزوں نے نواب رام پور کی کثیر فوج لے کر مرادآباد پر چڑھائی شروع کر دی۔ شاہ زادہ فیروز شاہ کی سرپرستی میں مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کے علمِ جہاد کے زیر سایہ مجاہدین جنگ آزادی نے نواب کی فوج اور انگریزوں سے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا، حتیٰ کہ بعض خواتین مردانہ لباس زیب تن کر کے میدان میں آئیں اور مخالفین کے دانت کھٹے کیے۔ لیکن حریت نوازوں کو شکست ہوئی اور انگریز شہر پر قابض ہو گئے۔ شاہ زادہ فیروز شاہ سنبھل والی سڑک سے روانہ ہوا اور کندرکو ہوتا ہوا قصبہ آنولہ سے گزر کر بریلی جا پہنچا۔ اگرچہ انگریزوں نے اس کا بے حد تعاقب کیا، مگر فیروز شاہ کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔

شہر پر قبضہ کرتے ہی انگریز افسران نے ضلع کلکٹر ساانڈرس کی فجو خاں کی پناہ میں دی ہوئی عورتیں واپس لیں۔ نواب فجو خاں اس تحریکِ آزادی میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے قطعی محفوظ تھے اور ان پر کوئی حرف نہیں آیا تھا۔ لیکن یورپین عورتیں واپس گئیں تو انھوں نے افسران سے فجو خاں کی شکایات کیں، جس کو انگریز افسران برداشت نہ کر سکے اور انھیں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا اور چونے میں پسوا کر ان کی لاش کو ہاتھی کے پیر سے بندھوا کر کھنچوایا گیا اور ان کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی۔

انگریزوں نے برسرِ اقتدار ہوتے ہی شمع حریت کے پروانوں کی ایک طویل فہرست بنائی۔ فہرست میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ گرفتاریاں شروع کر دی گئیں۔ محبانِ وطن کے لیے سزائے موت کا حکم جاری ہونے لگا۔ شہر کی مختلف سمتوں میں پھانسی گھر قائم کیے گئے۔ پھانسیوں کا مرکز سرائے پختہ کے سنبھلی گیٹ کے متصل رکھا گیا۔ جاں نثارانِ قوم کو پھانسیاں دی جانے لگیں۔ حریت کے پروانوں کے لیے کوئی قانون اور انصاف نہ تھا۔ جو شخص جس کا بھی نام لے لیتا، اس کو انتہائی بے رحمی سے پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جاتا اور پھانسی کے بعد انھیں وہیں دفنا دیا جاتا تھا۔ شہدائے ملت کی یاد میں ایک محلہ اب بھی آباد ہے جو گل شہید کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

ایک شخص نے جو مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کے دسترخوان کا ریزہ چین بھی رہ چکا تھا، متعلقہ انگریز افسر کو مولوی صاحب مذکور کی تحریکِ آزادی کی مخبری کر دی اور گرفتار کرا دینے کی حامی بھر لی۔ اس افسر نے اسی وقت ایک رسالہ اس نمک حرام کے ہم راہ مولوی صاحب کو گرفتار کرنے کے لیے بھیج دیا۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور عصر، مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔ اس نمک حرام نے ملازم کے ذریعہ اپنی آمد کی اطلاع دی۔ مولوی صاحب ان دنوں انتہائی محتاط تھے، مگر آنے والے کا نام سنتے ہی ان کی احتیاط اور وقت کی نزاکت، نرم دلی، خلوص اور ہم دردی تلے دب گئی اور انھوں نے فوراً ہی صدر دروازہ کھول دینے کا حکم صادر فرما دیا۔ دروازہ کھلتے ہی اس نمک حرام کے ساتھ فوجی رسالہ بھی دیوان خانے میں داخل ہوا اور آزادی سے آگے بڑھا۔ اس پر ایک نمک حلال ملازم نے تیوری بدل کر مداخلت کی، جس کو اسی وقت شہید کر دیا۔ مولوی صاحب نے اپنی بندوق جو قریب ہی بھری ہوئی رکھی تھی، اٹھائی، لیکن معاً ان پر گولیاں برس پڑیں اور ان کی روح کلمہ پڑھتی ہوئی قفسِ عنصری سے عالمِ بقا کی طرف پرواز کر گئی۔ آقا اور ملازم کی لاش فوجی رسالہ اپنے ساتھ لے گیا اور ان کی تمام آبائی جائداد ضبط کر لی گئی۔

مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو اور ان کے ملازم دونوں شہدا کی پختہ قبریں خطیرہ کے اندرون واقع محلہ کنجری سرائے نعل بندوں کی مسجد کے قریب کچہری روڈ کے متصل میدان میں نیم کے اشجار کے سائے میں موجود ہیں۔

خدا رحمت کند بر عاشقانِ پاک طینت را

ماٰخذ و مراجع

1- تاریخ الٰہ آباد، از: مفتی افضل خاں الٰہ آبادی، مطبوعہ افضل پریس، الٰہ آباد
2- غدر کے چند علما، از: مفتی انتظام اللہ شہابی، مطبوعہ دینی بک ڈپو، دہلی
3- تاریخ بدایوں، از: وکیل احمد مفتی بدایونی، مطبوعہ شمسی پریس بدایوں
4- ہفت روزہ لیل و نہار، لاہور، بابت ماہ مئی 1957ء، جنگ آزادی نمبر
5- حدائق الحنفیہ، از: مولانا فقیر محمد صاحب جہلمی، مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ
6- رسالہ معلم الاخلاق، علی گڑھ، بابت ماہ اکتوبر 1875ء
7- روزنامچہ غالب، مطبوعہ دہلی
8- تاریخ شعرائے دہلی شریف، از: مولانا فضل قیوم قادری، مطبوعہ افضل المطابع، دہلی
9- ماہ نامہ طریقت دہلی، ائمۂ اہلِ سنت نمبر، اپریل 1920ء
10- تذکرہ منیر، مطبوعہ عظیم آباد
11- دہلی کا ادب، از میر اعجاز حسین دہلوی
12- رسالہ دبدبہ سکندری، رام پور، از: مرزا رحمت علی رام پور، 1230ھ
13- تاریخ مرادآباد، از: عبدالقیوم مرادآبادی، مطبوعہ مرادآباد
14- بریلی کے شاعر و ادیب، از: مولانا افضل حق بریلوی، مطبوعہ افضل المطابع
15- تذکرہ شاہ مینا، از: ابوالحسن مینائی، مطبوعہ افضل المطابع لکھنؤ
16- جنگ آزادی کے شعرا، از: محمد نعمان قادری بریلوی، مطبوعہ افضل المطابع لکھنؤ
17- علمائے اہلِ سنت خیرآباد، از: مولانا وکیل احمد سکندر پوری، مطبوعہ حسن پریس، دہلی
18- نکات الشعرا، از: فضل کریم اودھی، مطبوعہ افضل المطابع لکھنؤ

تحریکِ آزادی اور بیگم حضرت محل

محمد حسین مصباحی

ہمارا پیارا وطن ہندستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے جھانسے میں آکر حکومتِ انگلشیہ کا غلام بن گیا اور سال ہا سال اس غلامی کی زنجیر میں جکڑا رہا۔ تجارت کے بہانے ہندستان میں داخل ہو کر انگریزوں نے ملک کی داخلی اور خارجی سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا اور ہندستانی بادشاہوں کی کم زوریوں پر مطلع ہو کر انھیں یرغمال بنا لیا۔ اس طرح دھیرے دھیرے انگریز تختِ شاہی پر قابض ہو گئے۔ اقتدار میں آنے کے بعد انگریز ہندستانیوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنانے لگے۔ ان کی مخالفت کی صورت میں ہندستانیوں کو تختۂ دار پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ اس لیے بلا اختلافِ مذہب و ملت پورا ہندستان سر پر کفن باندھ کر انگریزوں سے مقابلے کے لیے میدان میں اتر آیا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں بھی سانس لی تھی، مسلم سلاطین اور حکمرانوں نے انھیں کیسی پر امن زندگی عطا کی تھی، انھیں بخوبی یاد تھا۔ انگریز تجارت کے بہانے حکومت اور حکومت کی آڑ میں ہندستانیوں کے دین و مذہب پر بھی شب خون مار رہے تھے۔ انھیں موروثی مذہب چھوڑ کر دینِ عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ ان اسباب کی بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر انگریزوں کو ملک سے نکال پھینکنے کا عزم مصمم کر لیا۔ چناں چہ 1857ء میں میرٹھ کی چھاؤنی سے بغاوت کا شعلہ بھڑکا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی لہر پورے ہندستان میں پھیل گئی۔ جدو جہد آزادی کی سب سے اہم جنگ 1857ء کی ہے۔ اس جنگ میں اہلِ وطن نے سر پر کفن باندھ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا اور یہ ثابت کرنے کی بھر پور کوشش کی کہ:

ع: سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں

اس جنگ میں علمائے کرام نے قائدانہ کردار ادا کیا اور صرف زبانی ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی اس میں شرکت کی۔ ضرورت پڑی تو شمشیر و سناں لے کر میدانِ کارزار میں اتر آئے، اسی طرح وطن کی محبت میں سرشار کچھ جاں باز خواتین نے بھی اس جنگ میں اپنی سرفروشی کا ثبوت پیش کیا۔ ان جاں باز خواتین میں ایک نام ”بیگم حضرت محل“ ہے۔ بیگم حضرت محل حاکم اودھ واجد علی شاہ کی بیوی تھیں۔ 1847ء میں واجد علی شاہ اودھ کا بادشاہ بنا۔ واجد علی شاہ سے پہلے ہی اودھ کے حکمران انگریزوں کے سامنے سپر ڈال چکے تھے۔ انگریزوں کا ایک ریزیڈینٹ (Resident) لکھنؤ میں رہتا تھا۔ اس کی مرضی کے خلاف اودھ کے حکمران کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ واجد علی شاہ بھی پیش رو سلاطین کی طرح مجبورِ محض تھا۔ اس کی حکومت کو کٹھ پتلی حکومت کہا جا سکتا ہے۔ سارے احکام و فرامین ریزیڈینٹ کی طرف سے جاری ہوتے تھے۔ بالآخر ایک دن ایسا آیا کہ انگریزوں نے واجد علی شاہ کے خلاف الزامات کی ایک لمبی فہرست تیار کر کے انھیں تختِ شاہی سے اتار دیا۔ واجد علی شاہ کے سامنے تختِ شاہی کو چھوڑ دینے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ حکومت نہ چھوڑنے کی صورت میں انگریزوں سے جنگ کرنی پڑتی اور جنگ کی صورت میں اسے شکست سے دوچار ہونا پڑتا، کیوں کہ اس کے پاس انگریزوں کی مسلح افواج سے مقابلہ کرنے کے لیے طاقت ور فوج نہ تھی۔ ناچار حکومت کو چھوڑ کر وہ ایک فریادی بن گیا۔ اودھ پر انگریزوں کی باضابطہ حکومت ہو گئی اور واجد علی شاہ لندن جا کر انگریزی پارلیمینٹ کے سامنے اپنی فریاد پیش کرنے کے ارادہ سے لکھنؤ سے نکل گیا۔ لکھنؤ چھوڑتے وقت اس نے بیگمات کو عام اجازت دے دی کہ وہ محل چھوڑ کر جا سکتی ہیں۔ کچھ بیگمات محل چھوڑ کر چلی گئیں، لیکن کچھ بیگموں نے محل سے جانا وفاداری کے خلاف سمجھا۔ ان میں بیگم حضرت محل بھی تھیں۔

ادھر لکھنؤ چھوڑنے کے بعد واجد علی شاہ جب کلکتہ پہنچا تو انگریزوں نے اُسے وہیں ایک قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ لکھنؤ میں انگریزوں کا اقتدار تو ہو گیا، مگر شہر بھر میں نفرت کی آگ سلگ رہی تھی، بغاوت کی آگ لکھنؤ ہی نہیں بلکہ پورے ہندستان میں سلگ رہی تھی۔ بغاوت کا آغاز میرٹھ کی چھاؤنی سے ہوا۔ اس کے بعد ہندستان میدانِ کارزار بن گیا۔ 30/مئی 1857ء کو لکھنؤ میں بھی جنگ کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، انگریزی فوج سے لڑتے ہوئے میدان میں اتر پڑے۔ اودھ کی فوج کا کوئی بادشاہ نہیں تھا۔ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی ایک جتھے کی قیادت کر رہے تھے۔ واجد علی شاہ تو کلکتہ کے قلعہ میں نظر بند تھا۔ اس وقت عنانِ حکومت سنبھالنا بڑا دشوار تھا، لیکن اس مشکل گھڑی میں واجد علی شاہ کی چہیتی بیوی بیگم حضرت محل نے اپنی دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے نابالغ بیٹے برجیس قدر کو اودھ کا بادشاہ بنا دیا۔ انھیں بخوبی پتہ تھا کہ نام بیٹے کا ہوگا لیکن سارا کام انھیں ہی کرنا ہے۔[1]

بلوا چوک، جے نگر، مدھوبنی، بہار

بیگم حضرت محل نے برجیس قدر کی جانب سے یہ اعلان کرا دیا کہ ہم نے اپنی حکومت واپس لے لی ہے، انگریز اودھ کی حدود سے باہر نکل جائیں اور وہ ملازمین جو انگریزوں کے برسرِ اقتدار آجانے کی وجہ سے برطرف کر دیے گئے تھے، واپس آجائیں۔ بیگم حضرت محل کے اس فرمان پر آن کی آن میں ایک بڑی فوج تیار ہو گئی اور انگریزوں کو تہِ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ بیگم حضرت محل بہ ذاتِ خود میدانِ جنگ میں موجود رہتی تھیں۔ بیگم حضرت محل کی فوج نے بڑی تیزی سے کامیابیاں حاصل کرنا شروع کیں۔ کہا جاتا ہے کہ ”صرف گیارہ دن میں اودھ کے کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کوئی حاکم نہ تھا اور انگریزی عمل داری خواب معلوم ہوتی تھی۔“[2]

جائے حیرت ہے کہ واجد علی شاہ نے قبل از وقت ہی شکست سے گھبرا کر تختِ شاہی کو خیر باد کہہ دیا تھا اور اس کی بیوی نے صرف گیارہ دن میں ایسی زبردست کامیابی حاصل کی کہ پورے اودھ میں حکومتِ انگلشیہ کا کوئی حاکم نہ بچا۔ حالاں کہ بیگم حضرت محل کو بہ یک وقت دو محاذوں پر مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ ایک تو انگریزوں سے اور دوسرا محاذ شاہی محل تھا، کیوں کہ محل کی بیگمات انھیں سخت وست کہا کرتی تھیں۔ ان میں سے بعض پر یہ بھی شبہہ تھا کہ انگریزوں سے مل کر سازش رچ رہی ہیں اور محل کی خبریں خفیہ طور پر انگریزوں کو پہنچاتی ہیں۔ اب بیگم حضرت محل کا نشانہ ریزیڈینٹ کی رہائش گاہ بیلی گارڈ تھی۔ اگر بیلی گارڈ فتح ہو جاتا تو اودھ مکمل طور سے ان کے قبضے میں ہو جاتا۔ بیلی گارڈ پر فوج کشی کرنے سے قبل انھیں محل کی بیگمات سے دو دو ہاتھ کرنا پڑا تھا، کیوں کہ بیگمات کہتی تھیں کہ اگر بیلی گارڈ پر حملہ ہوا تو انگریز کلکتہ میں واجد علی شاہ اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیں گے۔ اس کش مکش میں بیگم حضرت محل کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں۔ چند دنوں بعد بیگم حضرت محل نے حاکمِ اودھ کی طرف سے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے پاس سفیر بھیجا اور اودھ کی جنگی سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔ بہادر شاہ ظفر نے مہر خطاب دینے کی یقین دہانی کی اور حاکمِ اودھ (برجیس قدر) کے نام جوابی خط ارسال کیا۔ اسی درمیان انگریزوں نے دہلی پر چڑھائی کر دی اور دہلی پر بھی اپنا قبضہ قائم کر لیا۔ اودھ کا سفیر بڑی مشکل سے جان بچا کر لکھنؤ واپس آیا اور اس نے بیگم حضرت محل کو خبر دی کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ ادھر بیگم حضرت محل نے بیلی گارڈ پر ہلہ بول دیا۔ بیلی گارڈ کی دیواریں گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھیں لیکن ابھی تک بیگم حضرت محل بیلی گارڈ کو فتح نہ کر سکی تھی۔ انگریزی فوج کے آنے سے پہلے بیلی گارڈ پر قبضہ کرنے کے لیے بیگم حضرت محل نے پھر ایک مرتبہ بھر پور حملہ کیا۔ اسی درمیان یہ خبر مشہور ہو گئی کہ انگریزوں نے بیلی گارڈ سے نکل کر ہندستانی فوج کو شکست دے دی ہے، اب وہ قیصر باغ کی طرف آرہے ہیں۔ اس خبر کے سنتے ہی قیصر باغ میں افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا۔[3]

بیگم حضرت محل نے قیصر باغ کے تمام پھاٹک بند کروا دیے۔ اب انگریز واقعی قیصر باغ کی طرف آرہے تھے۔ انگریزوں نے قیصر باغ پر حملہ کر دیا، اور گولیوں سے باغ کی دیوار میں شگاف ڈال دیا۔ قیصر باغ میں زبردست لڑائی چھڑ گئی۔ اس درمیان ہندستانی فوج کا ایک دستہ بھی آگیا۔[4] قیصر باغ میں خون کی ندیاں بہنے لگیں اور لاشوں کے انبار لگ گئے۔ مرقعِ خسروی میں بیلی گارڈ کے تعلق سے تحریر ہے کہ: ”شہر میں صدائے توپ و تفنگ سے تہلکہ تھا، بیلی گارڈ قتل گاہ کا نمونہ تھا۔“[5]

اودھ پھر سے انگریزوں کے ہاتھ میں آگیا۔ بیگم حضرت محل عورتوں کے ہم راہ قیصر باغ کی عقبی دیوار سے باہر نکل گئیں۔ حسین آباد میں ایک بار پھر انھوں نے بچی کھچی فوج کو یک جا کر کے انگریزوں سے جنگ کی، لیکن ان کی آخری کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ بیگم حضرت محل شکست خوردہ ہو کر بھی بلند ہمت تھیں۔ انھوں نے جنگ ہاری مگر انگریزوں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اس کس مپرسی کے عالم میں انھیں حکومتِ انگلشیہ کا پیغام ملا کہ آپ مصالحت کر لیجیے، آپ کی حکومت آپ کو واپس کر دی جائے گی۔ لیکن بیگم حضرت محل نے اس پیغام کو اہمیت نہ دی، انھوں نے جواب دیا کہ ہم کسی کی بھیک دی ہوئی حکومت نہیں چاہتے۔ ہمیں اپنے دست و بازو کی قوت سے حاصل کردہ حکومت پسند ہے۔ انھوں نے انگریزوں کی باتوں کو در خورِ اعتنا نہ سمجھا اور ترکِ وطن کا ارادہ کر لیا، چناں چہ ہندستان چھوڑ کر نیپال کے لیے روانہ ہو گئیں اور آخری وقت تک انھوں نے نیپال میں سکونت اختیار کی۔ قیامِ نیپال کے دوران بھی انھیں حکومتِ انگلشیہ نے ہندستان میں رہنے کی دعوت و اجازت دی اور ساتھ میں سہولیات بھی فراہم کرنے کی یقین دہانی کی لیکن بیگم حضرت محل نے اس پیش کش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ مادرِ وطن کو انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے رہائی دلانے کے لیے ہم نے قربانیاں دیں اور اب اس وطن میں ہم دشمنوں کے مہمان بن کر رہیں؟؟؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا!

بقیہ زندگی آپ نے نیپال میں بسر کی اور، وہیں آپ کا مدفن بھی ہے۔

حوالے

(1) انقلاب 1857، از: پی. سی. جوشی، ص:50
(2) نیا دور انقلاب 1857ء نمبر، ص:51
(3) ایضاً، ص:52
(4) ایضاً، ص:53
(5) مرقعِ خسروی، ص:505

حکیم سعید اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ

محمد صادق قصوری

جنگ آزادی 1857ء میں علما و مشائخ نے جو کردار ادا کیا، وہ تاریخ سے دل چسپی رکھنے والے حضرات سے مخفی نہیں ہے۔ مجاہد کبیر مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا کفایت علی کافی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا احمد اللہ وغیرہم کے کارناموں سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے فرنگی راج کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی۔ مگر غدارانِ ملت نے آزادی کے سورج کو طلوع نہ ہونے دیا۔ حکیم سعید اللہ بھی قدسی گروہ کے ممتاز فرد تھے جس نے کمپنی کے تسلط سے وطن عزیز کو آزاد کرنے کی بھرپور جدو جہد کی۔

حکیم سعید اللہ بن مولوی حافظ حکیم عظیم اللہ بن حکیم حبیب اللہ بن حکیم احمد اللہ بن حافظ احسن اللہ قصبہ آنولہ ضلع بریلی میں 1826ء/1242ھ میں متولد ہوئے۔ (1857ء کے مجاہد، از: غلام رسول مہر، مطبوعہ لاہور/ 1971ء، ص:312، مشاہیر جنگ آزادی، از: مفتی انتظام اللہ شہابی، مطبوعہ کراچی 1957ء، ص:28/ جنگ آزادی 1857ء واقعات و شخصیت، از: پروفیسر محمد ایوب قادری۔)

آپ کے مورثانِ اعلیٰ دورِ روہیلہ میں خاص شہرت اور حیثیت کے مالک تھے۔ نواب علی محمد خاں والیِ روہیل کھنڈ نے حضرت شاہ نور غازی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے مصارف کے واسطے جو نو سو نواسی بیگھہ اراضی وقف کی تھی اس کی تولیت آپ کے جدِ اعلیٰ حکیم حبیب اللہ کے سپرد کی جو اس کے دور کے مخصوص اطبا میں سے تھے اور جنھوں نے اس خدمت کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ 1774ء میں جب شجاع الدولہ نے بعد فتح روہیل کھنڈ، پیلی بھیت، بریلی، آنولہ، منونہ اور بسولی وغیرہ کو تاراج کیا تو اس وقت حکیم صاحب کا خاندان بھی برباد ہوا۔ روہیل کھنڈ میں کمپنی کی حکومت قائم ہونے کے بعد حکیم صاحب کے والد حکیم عظیم اللہ صاب نے آنولہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ واقعہ 1828ء کا ہے۔ (ماہ نامہ الشجاع کراچی، جنگ آزادی 1857ء نمبر، ص:47)

طبابت کا پیشہ حکیم صاحب کے خاندان میں موروثی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ کے دادا اور والد بڑے فاضل طبیب اور عدیم النظیر دین دار تھے۔ حکیم صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی، اس کے بعد بریلی، مراد آباد، رام پور اور دہلی سے استفادہ کیا۔ طب میں اپنے وطن کے فاضل حکیم منا سے بھی فیض حاصل کیا۔ قرآن کریم کے دس سپارے حفظ تھے۔ علمِ نجوم میں بھی دسترس بلکہ مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ حکیم سعادت علی خاں رئیسِ اعظم آنولہ و مدار المہام ریاست رام پور آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ (جنگ آزادی 1857ء، از: پروفیسر محمد ایوب قادری)

حکیم صاحب نے حضرت شاہ آلِ برکات مارہروی رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی تھی۔ خانوادۂ قادریہ مارہرہ سے ہمیشہ تعلقات رہے۔ فقرا اور درویشوں سے اکثر صحبت رکھتے تھے۔ بچپن میں اپنے وطن کے مجذوب اور صاحبِ باطن بزرگ اکبر علی شاہ عرف نیا شاہ کو دیکھا تھا۔ حضرت اچھے میاں مارہروی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ و شاہ میرن میاں بریلوی (المتوفی 1274ء) نزیل آنولہ سے بھی گہرے مراسم تھے۔ خطِ نسخ میں خوب مہارت تھی۔ فقہ و تصوف وغیرہ میں کئی رسالے لکھے تھے۔

(ماہ نامہ الشجاع کراچی، جنگ آزادی 1857ء نمبر، ص:47)

1857ء میں جب جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو نواب خان بہادر خاں نبیرۂ حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے روہیل کھنڈ میں علمِ جہاد بلند کیا تو مسلمانانِ آنولہ نے ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جنگ آزادی میں پورا پورا حصہ لیا۔ نواب خان بہادر خاں بہت مدبر اور جہاں دیدہ شخص تھے، ان کی کمان میں مجاہدین نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ نواب صاحب نے نواب کلن خاں نبیرہ بخشی سردار خاں کو آنولہ کا حاکم مقرر کیا۔ حکیم سعادت علی خاں ولد حکیم مردان علی خاں ولد حافظ اعظم علی خاں، نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور کے مدار المہام، انگریزوں کے دوست، مددگار اور معاون تھے اور آنولہ کے رئیسِ اعظم تھے۔ انھوں نے ہر چند مجاہدین کو جنگ آزادی میں حصہ لینے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ نواب کلن خاں کے تقرر کے بعد حکیم سعید اللہ نے نامہ و پیام کے فرائض بھی انجام دیے اور میدانِ رزم میں بھی دادِ شجاعت دی۔ ایک جمعیت کے ساتھ گکرالہ ضلع بدایوں، شہزادہ فیروز شاہ کی ہم راہی میں بڑھے۔ اس کے بعد کنپلہ ضلع فرخ آباد پہنچے۔ آخر میں بریلی کے آخری معرکہ میں بھی شریک رہے۔ (ماہ نامہ الشجاع کراچی، جنگ آزادی 1857ء نمبر، ص:47-48، مولانا محمد احسن نانوتوی، از: پروفیسر محمد ایوب قادری، مطبوعہ کراچی، 1966ء، ص:121)

فتویٰ جہاد کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں مولانا کفایت علی کافی جب مراد آباد سے آنولہ پہنچے تو حکیم سعید اللہ کے ہاں ہی قیام فرمایا، کیوں کہ دونوں ہم درس رہ چکے تھے اور آپس میں خاص تعلقات بھی تھے۔ حکیم سعید اللہ دورانِ انقلاب دہلی بھی گئے تھے اور خیال ہے کہ حکیم صاحب کے دستخط اس فتویٰ پر بھی تھے جو مجاہدِ کبیر مولانا فضل حق خیر آبادی نے جنرل بخت خاں کے ایما و مشورہ سے مرتب کیا تھا۔ (ماہ نامہ الشجاع کراچی، جنگ آزادی 1857ء نمبر، ص:47-48، مولانا محمد احسن نانوتوی، از: پروفیسر محمد ایوب قادری، مطبوعہ کراچی، 1966ء، ص:121)

آنولہ میں چند مہینے نواب خان بہادر خاں کی حکومت قائم رہی۔ پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:

"یہ نہایت امن و امان کا دور رہا۔ اس زمانے میں اندرونِ شہر کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ البتہ جب دیہات کے مفسدین نے آنولہ کا رخ کیا تو بڑے سخت معرکے ہوئے، بلوائیوں نے شکست کھائی اور بھاگ گئے۔ پہلا معرکہ موضع ارلا اور سولا کے ٹھاکروں سے ہوا۔"

حکیم سعادت علی خاں نے بڑی کوشش کی کہ مسلمانانِ آنولہ، نواب خان بہادر خاں کے مقرر کردہ حاکم نواب کلن خاں کا ساتھ چھوڑ دیں، مگر اس میں ان کو کامیابی نہ ہوئی، لہٰذا وہ خاموش ہو گئے مگر اپنی کوشش برابر جاری رکھی۔ ادھر مجاہدین کا سخت زور تھا، لیکن مجاہدین نے حکیم سعادت علی خاں کے خاندان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ ہر جمعہ کو مساجد آنولہ میں جہاد کا وعظ ہوتا تھا۔ فتویٰ جہاد کی نقول جس کو جنرل بخت خاں نے دہلی میں علما سے تیار کرایا تھا، مولانا کفایت علی کافی کے ذریعہ آنولہ پہنچیں۔ مولانا کفایت علی کافی حکیم سعید اللہ کے یہاں ایک ہفتہ مقیم رہے۔ اس دوران ان کے جہاد پر وعظ بھی ہوئے اور نواب مجو خاں حاکم مراد آباد کا پیغام بھی نواب کلن خاں کو پہنچایا۔ اس کے بعد مولانا کافی نواب خان بہادر کے پاس بریلی تشریف لے گئے۔

نواب کلن خاں نے اتر چیڈی اور اس کے نواح میں مسٹر پیتم سنگھ کو اور منونہ اور اس کے نواح میں مصدق علی کو مالیانہ کا ٹھیکہ دیا۔ جب آنولہ میں مجاہدین کا زور ہوا تو حکیم سعادت علی خاں کو بہت فکر ہوئی۔ اس سے قبل وہ نواب یوسف علی خاں اور انگریز حکام کو یہی اطلاع دیتے تھے کہ آنولہ میں بالکل امن و امان ہے۔

آخر جولائی میں حکیم سعادت علی خاں ریاست رام پور کی فوج کے ساتھ آنولہ آئے۔ فوج باہر پڑی رہی، حکیم صاحب واپس چلے گئے۔ مجاہدین کو ہر وقت حکیم سعادت علی خاں سے اندیشہ تھا۔ آخر جب نواب خان بہادر خاں کو شکست ہوئی، بریلی پر انگریزی فوج کا تسلط ہو گیا اور انگریزی حکومت قائم ہو گئی تو آنولہ کا انتظام حکیم سعادت علی خاں کے سپرد ہوا۔ (جنگ آزادی 1857ء، از: پروفیسر محمد ایوب قادری)

حکیم سعادت علی خاں نے آنولہ کا حاکم مقرر ہونے کے بعد نواب کلن خاں اور ان کے رفقائے کار کو طلب کیا، نواب حسن سے کوئی مواخذہ نہ ہوا۔ نواب جان محمد، نواب کلن خاں کو حکیم صاحب نے اپنے پاس تین روز رکھا۔ نواب جان محمد آزاد کر دیے گئے۔ نواب کلن خاں کو رام پور لے گئے، اور چند ماہ بعد رہائی ہو گئی۔ نواب شیخ خیر اللہ کی جائداد ضبط ہوئی اور بیدوں کی سزا پائی۔ حکیم سعید اللہ اور مولوی اسماعیل فرار ہو گئے۔ دونوں نے ککرالہ ضلع بدایوں پر انگریزوں سے مقابلہ کیا، پھر کنپلہ ضلع فرخ آباد میں نواب عبد القدیر خاں کے ہم راہ لڑے۔ جب فرخ آباد، بدایوں، شاہ جہاں پور، مراد آباد، بریلی سب جگہوں پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو یہ دونوں ساتھی جنگلوں میں چھپے رہے۔ عام معافی پر حکیم صاحب ظاہر ہوئے، کچھ عرصہ سرولی میں سکونت اختیار کی اور پھر آنولہ آ گئے۔

اسّی سال کی عمر میں دردِ مثانہ اور حبس البول کی شکایت ہو گئی اور یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ 1907ء/1325ھ میں عالمِ جاودانی کو سدھار گئے اور اپنے والد حکیم عظیم اللہ کے ہم پہلو عبد اللہ شاہ کے تکیہ واقع محلہ گھیرانو خاں میں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (مولانا محمد احسن نانوتوی، از: پروفیسر محمد ایوب قادری، مطبوعہ کراچی، 1966ء، ص:121، مشاہیر جنگ آزادی، ص:29، 1857ء کے مجاہد، مطبوعہ لاہور، 1971ء، ص:212)

حکیم صاحب بہت بلند اخلاق، پابند شرع اور خدا رسیدہ بزرگ تھے، صلہ رحمی کے لیے بہت مشہور تھے، طلبہ کی بہت مدد فرماتے تھے۔ حکیم صاحب کی بہن "بیگم بوا" عرف "بگا بوا" تھیں۔ مرحومہ کا انتقال 1935ء میں ہوا ہے۔ وہ بیان کرتی تھیں کہ ہمارے بھائی حکیم سعید اللہ کو موذی فرنگی سے سخت نفرت تھی اور وہ حکیم صاحب کی روپوشی کے واقعات بہت تفصیل سے سنایا کرتی تھیں۔ (ماہ نامہ الشجاع کراچی، جنگ آزادی 1857ء نمبر، ص:48) ......(باقی، ص:108 پر)......

1857ء کے بعد انگریزوں کی دہشت گردی

غلام مصطفیٰ قادری رضوی

1857ء ایک قیامت خیز تحریک تھی، جس نے برطانوی افراد کو متزلزل کردیا تھا۔ انگریز ہندستان میں افیون کی گولی کھا کر نہیں آئے تھے، بلکہ نہایت شعور اور چابک دستی کے ساتھ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے یہاں قدم جمائے تھے۔ وہ آئے تو تجارت کی غرض سے تھے مگر جوں جوں اپنی تجارت کو فروغ وارتقا کی منزل پر دیکھتے رہے، مسلمانوں کی عظمت وشوکت کا بھی مشاہدہ کرتے رہے۔ انھیں یقین ہوگیا کہ اس ملک میں حکومت وسلطنت کے استحکام کے لیے سب سے پہلے ہمیں قومِ مسلم کو ختم کرنا ہوگا۔ اپنے ان مقاصد سیئہ کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور مذہبی شعائر کو مجروح کرنا شروع کیا۔ اس طرح بغاوت وعداوت کے شعلے ان کے دلوں میں بھڑکنے لگے تو حالات کے پیشِ نظر علماے حق اہلِ سنت وجماعت نے ان کے ظلم واستبداد سے اہلِ اسلام کو بچانے کے لیے تحریک چلائی اور ان سفید چمڑی والوں کو سات سمندر پار واپس بھیجنے پر مجبور کردیا۔ حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر مجاہدینِ اسلام نے انگریزوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملادیا۔ علامہ فضل حق خیرآبادی نے فتویٰ جہاد دیا، علمانے اس کی تصدیق کی۔ اس طرح ملک بھر میں ہنگامہ ہوا، مسلمان بیدار ہوئے، انگریزوں کے تئیں ان کے جذبات میں تیزی آئی، اس طرح انقلاب کا آغاز ہوا اور آزادیِ ہند کے لیے ملک بھر سے چھوٹے بڑے اپنی طاقت بھر قربانیاں دیتے رہے، بالآخر 1947ء میں بھارت آزاد ہوا اور ساکنانِ ہند نے چین کی سانس لی، مگر 1857ء کے بعد بدلہ لینے کی غرض سے انگریزوں نے جو ظلم کیے وہ قابلِ مذمت ہیں۔

"دہلی اور اس کے اطراف پر قبضہ کے بعد انگریزوں نے جو روح فرسا اور انسانیت سوز مظالم ڈھائے وہ تاریخ کا ایک شرم ناک اور سیاہ ترین باب ہے۔ اس کا صفحہ صفحہ خون میں شرابور اور سطر سطر فریادی ہے۔ یہاں پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ 1857ء کے خونی معرکہ سے پہلے انگریزوں کا ہیڈ کوارٹر کلکتہ تھا، مگر 1857ء کی جنگ میں کامیابی کے بعد دہلی تبدیل ہوگیا اور دہلی پر قبضہ کے بعد انگریزوں نے دہلی کی کل آبادی کو شہر سے نکال دیا تھا۔ ایک ماہ بعد ہندوؤں کو اپنی دولت کا دس فی صد حکومت کو دینے کے بعد داخلہ کی اجازت ملی، جب کہ مسلمانوں کا داخلہ سات ماہ بعد اپریل 1858ء میں اپنی دولت کا پچیس فی صد ادا کرنے پر ہی ہو سکا۔ بہت سوں کی جائدادیں ضبط کرلی گئیں۔ لال قلعہ کی دیوار سے چار سو گز تک کی عمارتیں حفاظتی نقطۂ نظر سے مسمار کرنے کی وجہ سے سیکروں اپنے آشیانوں سے محروم ہوگئے۔"

(جنگ آزادی اور وطن کے جاں باز، ص:53)

دہلی جیسے بڑی آبادی والے شہر کے ہنسی خوشی رہنے والے انسانوں پر انگریزوں نے ظلم وجبر کے جو پہاڑ توڑے، اس کی ناقابلِ بیان داستان ہے۔ مسرت وشادمانی کے ساتھ جو محلے آباد رہتے تھے، اب وہاں خوف اور دہشت کا عالم طاری تھا، خموشی چھائی ہوئی تھی، باہر نکلنے والوں کو تعفن آمیز لاشیں نظر آتی تھیں، انگریزوں کے کمانڈر لارڈ رابرٹس نے اس وقت کے دہلی شہر کی منظر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

"صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا۔ لال قلعہ کے لاہوری دروازے سے نکل کر ہم چاندنی چوک سے گزرے۔ دہلی حقیقتاً شہرِ خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے گھوڑوں کی سموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری۔ ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں، ہر نعش پر وہ حالت طاری تھی جو موت کی

کش مکش نے طاری کردی تھی۔ ہر نعش تجزیہ وتحلیل کے مختلف مراحل میں تھی۔ ہم چپ چاپ چلے جارہے تھے، یا سمجھ لیجیے کہ بے ارادہ زیرِ لب باتیں کررہے تھے تاکہ انسانیت کے ان دردناک باقیات کی استراحت میں خلل نہ پڑے۔ جن مناظر سے ہماری آنکھیں دو چار ہوئیں وہ بڑے ہی رنج افزا تھے۔ کہیں کوئی کتا کسی نعش کا برہنہ عضو جھنجھوڑ رہا تھا، کہیں کوئی گدھ ہمارے قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑ پھڑاتے پروں سے ذرا دور چلا جاتا، لیکن اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اڑ نہ سکتا تھا۔ اکثر حالتوں میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے، جیسے کسی کو اشارہ کررہا ہو۔ دراصل یہ پورا منظر اس درجہ بھیانک تھا کہ بیان میں نہیں آسکتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا، اس لیے وہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے۔ پوری فضا ناقابلِ بیان حد تک بھیانک تھی جو بڑی مضر بیماری اور بدبو سے لبریز تھی۔"

(جنگ آزادی اور وطن کے جاں باز، ص:54)

انگریزوں کے مظالم ناگفتہ بہ تھے۔ آج بھی ان کو پڑھ اور سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جنگ آزادی کا پرجوش انتقام لینے کے لیے ان کے کرتوتوں کی ایک طویل داستان ہے۔ چوں کہ انگریزوں کو معلوم تھا کہ اس انقلاب میں اہلِ اسلام پیش پیش ہیں، اس لیے مسلمانوں پر ان کا غصہ اور تیز تھا اور اس درجہ وہ جلال میں تھے کہ کثیر تعداد میں لاشوں کو دیکھ کر بھی ان کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا نہ ہو سکا بلکہ وہ برابر نئے نئے طریقوں سے قتل وغارت گری سے نہ چوکے۔ انگریز فوجی افسر ہنری کوٹن لکھتا ہے:

"دہلی دروازہ سے پشاور تک گرینڈ ٹرنک روڈ کے دونوں ہی جانب شاید ہی کوئی خوش قسمت درخت ہوگا جس پر انقلاب 1857ء کے ردعمل اور اسے کچلنے کے لیے ہم نے ایک یا دو عالمِ دین کو پھانسی پر نہ لٹکایا ہو۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً بائیس ہزار علماے کرام کو پھانسی دی گئی۔" (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما، ص:23)

"دہلی میں خوں ریزی کے عادی انگریز سپاہیوں نے جوش انتقام کو تسکین دینے کے لیے پھانسی دینے والے جلادوں کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ پھانسی کے تختے پر مجرم کو زیادہ دیر لٹکتا رہنے دیں تاکہ لاش تڑپنے کی دردناک کیفیت دیکھ کر، جسے وہ "ناچ" کہتے ہیں، اپنی خوں خوار طبائع کے لیے دلچسپی کا سامان بنا سکیں۔ جھجھر کے نواب صاحب کو جان دینے میں بہت عرصہ لگا۔"

"پھانسیاں دینے کے لیے رضا کارانہ ٹولیاں بنائی گئی تھیں، جنھوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے دیہات کا دورہ کیا، اس حالت میں کہ ان کے پاس پھانسی دینے کا سامان بھی مکمل نہ تھا اور نہ پھانسی دینے کے طریقے سے پوری طرح واقفیت تھی۔ چنان چہ ان میں ایک "شریف" آدمی اپنی کامیابی کا فخریہ اظہار کرتا تھا کہ "ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کرتے تھے۔ یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے اور رسہ ڈال کر ہاتھی کو ہنکایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ملزم اس طرح تڑپتا اور جانکنی کے عالم میں اکثر اوقات انگریزی زبان کے حرف S یا ہندسہ 8 کی دلچسپ شکل بن کر رہ جاتا۔"

(جنگ آزادی نمبر، راشٹریہ سہارا، دہلی، ص:9)

دہلی میں انگریزوں کے مظالم کی منظر کشی کرتے ہوئے ایک اور انگریز لکھتا ہے:

"میں نے دہلی کی گلیوں میں چلنا پھرنا ترک کردیا ہے کیوں کہ کل جب ایک افسر اور میں خود بیس جوانوں کو گشت کے لیے باہر لے گئے تو ہم نے چودہ مردہ عورتوں کو دیکھا، ان کے شوہروں نے ان کے گلے کاٹ دیے تھے اور انھیں شالوں میں لپیٹ کر لٹا دیا تھا۔ ہم نے وہاں ایک آدمی کو پکڑا، جس نے ہمیں بتایا کہ ان عورتوں کو اس ڈر سے قتل کیا گیا ہے کہ کہیں یہ انگریزوں کے چنگل میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ پھر اس نے ان کے خاوندوں کی لاشیں ہمیں دکھائیں۔" (اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور، جنوری 2007)

انگریز جنرل لکھتا ہے:

"ہم نے ایک بڑے گاؤں میں آگ لگا دی، جب

گاؤں کے باشندے آگ سے بچنے کے لیے بھاگے تو ہم نے انھیں گولیوں سے اڑا دیا۔''

سر جان نے اعتراف حقیقت کرتے ہوئے لکھا:

''انگریزوں نے انتقام کے جوش میں اندھے ہو کر نہ عورتوں کو بخشا نہ بچوں کو بلکہ بے گناہوں کا اس طرح قتل عام کیا گیا، جس طرح ان کو تہ تیغ کیا گیا جو اس بغاوت کے ذمہ دار تھے۔ کالے ہندستانیوں کو گولی سے اڑانے میں انتقام پسند انگریزوں کو ایک لطف سا آتا تھا۔'' (جنگ آزادی اور وطن کے جاں باز،ص:56)

1857ء میں انگریزوں کے جوشِ انتقام کے نتیجے میں علما سے لے کر عوام تک سیکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کے خون بہائے گئے، جن کو الگ الگ تحقیقات سے تاریخ آزادی میں بیان کیا گیا ہے۔ ان گورے جسم والوں کے بہیمانہ اور سفاکانہ انداز کو دیکھ کر اور پڑھ کر آج بھی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔ عوام الناس تو تھے ہی، علمائے کرام کے ساتھ ان کے قابلِ مذمت وحقارت سلوک کے بارے میں پڑھنے کے بعد جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جہاد حریت میں جو علما شریک ہوئے یا جن پر کسی طرح سے شرکت کا شبہہ ہوا، انھیں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ان کی جائداد اونے پونے نیلام کی گئی، املاک تباہ کیے گئے۔ مکانات زمین بوس کروا کے ہل چلوائے گئے، جلا وطنی، کالا پانی کی قید بامشقت برداشت کرنی پڑی۔ جیل خانہ کی آہنی سلاخوں میں جکڑے گئے، تہ خانوں میں بے آب و دانہ تڑپا تڑپا کر مارے گئے، دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹائے گئے، گرم گرم تیل کے کڑاہوں میں ڈالے گئے، گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندائے گئے، غرض کہ مصائب وآلام کے تمام حربے ان پر آزمائے گئے۔ مگر واہ رے ہمت مومنانہ، ان میں سے ایک بھی قدم پیچھے نہیں ہٹے۔ ان روح فرسا مناظر کا چشم دید گواہ انگریز مورخ ایڈورڈ ٹامسن اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''1864ء سے 1867ء تک انگریزوں نے علما کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ تین سال ہندستان کی تاریخ کے بڑے الم ناک سال ہیں۔ ان تین سالوں میں انگریزوں نے 14/ہزار علما کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ دلی کے چاندنی چوک سے خیبر تک کوئی ایسا درخت نہ تھا جس پر علما کی گردنیں نہ لٹکی ہوں۔ علما کے جسم کو تانبے سے داغا گیا، سور کی کھال میں لپیٹ کر جلتے ہوئے تندور میں ڈالا گیا، ہاتھیوں پر کھڑا کر کے درختوں سے باندھ کر ہاتھیوں کو نیچے سے چلا دیا گیا۔'' (حوالۂ مذکور)

ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں پانچ لاکھ مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ جو بھی معزز مسلمان انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا، اس کو ہاتھی پر بٹھایا گیا اور وہی سلوک اس کے ساتھ کیا گیا جو مندرجہ بالا سطور میں آپ ملاحظہ کر چکے۔ ظلم و بربریت کا یہ ننگا ناچ چشم اشک بار نے ماضی میں کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

امریش مشرا اپنی کتاب ''War of Civilization: India, South Asia, Europe and the World 1857-1867'' میں لکھتا ہے:

''1857ء میں جب انگریزوں کو پتہ چلا کہ ان کی شکست یقینی ہے تو انھوں نے اپنے قتل عام کے پلان کو انجام دیا۔ ان کی فتح کا واحد راستہ پورے شہروں اور گاؤں کو نیست و نابود کرنا تھا۔ بڑے پیمانے پر ہندستانی مرد وخواتین اور بچوں کا قتل کرنا تھا۔''

(بحوالہ روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی، یکم جون 2007ء)

مجاہدینِ آزادی نے ظلم واستبداد برداشت کرنے کے جو نمونے پیش کیے وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ انگریزوں کے جبر واستبداد کی یہ ہلکی سی جھلک تھی ورنہ انھوں نے اس سے بھی دردناک مظاہرے کیے تھے۔ وطن عزیز کی آزادی کے لیے علمائے اہلِ سنت کی قربانیاں فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ آج اس انقلاب کو ڈیڑھ سو سال پورے ہو چکے ہیں، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تحریکِ آزادی کے شہدا کو یاد کریں اور ان کے زریں کارناموں اور جاں نثاریوں سے عوام الناس بطور خاص نوجوان نسل کو واقف کرائیں۔ آج ہماری وفاداریِ وطن کو شک وشبہہ کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ ایسے حالات میں اور زیادہ ضرورت ہے کہ ہم آزادی کی تحریک کے تئیں مسلمانوں کے جذبات کو تاریخ کے حوالے سے متعارف کرائیں اور ثابت کر دیں کہ ؎

عزت سے ہم بھی جینے کے حق دار ہیں یہاں
شامل ہمارا خون بھی قربانیوں میں ہے

☆☆☆☆☆

جنگ کے بعد مسلمانوں کی حالتِ زار

ایم نواب نفیس

1857ء کی وہ جنگ جسے اہلِ وطن جنگ آزادی اور انگریز غدر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہندستانیوں کے نزدیک یہ جنگ اپنے حقوق کی بحالی کے لیے تھی، اپنی بقا وسلامتی کی مظہر تھی اور اپنی اس آزادی کی جدوجہد کے لیے تھی جو انگریزوں نے ان سے چھین لی تھی۔

یہاں یہ مرکوزِ خاطر رہے کہ نہ صرف آزادی ہی چھین لی تھی بلکہ ہندستانیوں کو سیاسی، معاشی، تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ چناں چہ یہی وہ عوامل تھے جن کی بحالی وتحفظ کی خاطر اہلِ ہند انگریزوں کے خلاف کمر بستہ ہوئے۔ اس پر مجھے ایک شعر یاد آتا ہے ؎

اگر خار بود گلدستہ گردد ۔۔۔ بہر کارکہ ہمت بستہ گردد

آغاز جنگ کچھ اس طرح ہوا کہ بتاریخ 23/جنوری 1857ء چھاؤنی رانی گنج میں آگ لگی۔ یہ آگ کیا تھی، گویا بھڑکتے ہوئے وہ جذبات اور ارمان تھے۔ وہ حسرتیں تھیں جن کی تکمیل شاید اب کوئی نہیں روک سکتا تھا: ع: یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

چناں چہ اس کے بعد دوسارجنٹ میجر صاحب کا یہی حال ہوا۔ تمام ٹھکانہ جل کر خاک ستر ہو گیا اور اسی طرح 25/جنوری کو برقی تار کا دفتر واقع باکپو میں زبردست آگ بھڑکی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بھی کام تمام ہو گیا۔ ان حقائق کے پیش نظر بادشاہ ناری نے اپنے غیض وغضب سے کام لیتے ہوئے مکمل تفتیش کا حکم صادر کر دیا، لیکن وہ شاید اس بات سے غافل تھے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ؎

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے

لیکن وائے نصیبا۔ ان گرگ صفت صحرائی درندوں نے مسلمانوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ ان کے اتحاد کو منتشر کر دیا۔ ستم بالائے ستم ان کی مکار اور بے رحم عدالت میں مسلمان مفتوح اور ظالم فاتح کی حیثیت سے آکھڑے ہوئے۔

اس جنگ میں ہندو پاک کے جن علاقوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس کا بالتفصیل حال بیان کرنے سے قاصر ہوں، کیوں کہ علاقے بے شمار ہیں۔ اس تنگی کے باعث ذیل میں صرف نام رقم کر رہا ہوں:

روہتک، کلکتہ، انبالہ، لکھنؤ، شملہ، روڑکی، گوالیار، برہام پور، کوہ منصوری، دھو پور، کوہ نینی تال، ملتان، فیروز پور، روہتی، حصار، نوگانوں، ڈیبا، پشاور، دینا پور، کوہ مری، امرت سر، راولپنڈی، پونہ، شکار پور، جلیہ گوری، مراد آباد، لاہور، سہارن پور، فتح گڑھ، آگرہ، جہلم، نصیر آباد، کراچی، مہد پور، سیال کوٹ، جون پور، جھانسی، شاہ جہاں پور، مسدورہ ضلع اودھ، بریلی شریف، الٰہ آباد، ہمیر پور، ساگر، جالندھر، بلند شہر، سرسا، گوپی گنج، اندور، مئو، اعظم گڑھ، منگیر، بنارس، حیدر آباد (دکن) ناگ پور، جبل پور، فیض آباد، اوریا، کوہِ آبو، سلطان پور، اودھ، اورنگ آباد، مدراس، حیدر آباد (سندھ) وغیرہ۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں میں ایک عجیب سی بددلی پھیل گئی۔ وہ عمل سے بے گانہ ہو کر بے یار ومددگار پھرنے لگے۔ ان کے دلوں میں ایک مایوسی سی گھر کر گئی تھی کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ہم ایک شکست خوردہ قوم ہیں، انگریز فاتح ہیں اور ہر فاتح قوم کی زبان بھی حکومت کرتی ہے۔

ادھر انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنے ظلم وبربریت کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ ان کی سیاسی، معاشی، تعلیمی، اقتصادی حالت ختم کر کے رکھ دی۔ اس کا مختصر حال کچھ اس طرح کا ہے:

سیاسی حالت: انگریزوں نے جنگ آزادی کے بعد اپنے اقتدار کو بہت ہی مضبوطی سے جما لیا اور مسلمانوں کو تخت وتاج سے محروم کر دیا۔ چناں چہ اس طرح مسلمانانِ ہند سیاسی اعتبار سے بالکل ختم ہو کر رہ گئے۔

معاشی حالت: جنگ آزادی کے بعد جب امن بحال ہوا تو اقتدار تو چھن ہی چکا تھا، جب حالات کا اور جائزہ لیا گیا تو مسلمانوں کو پتہ چلا کہ ہم اور بھی کئی شعبوں میں پیچھے رہ گئے ہیں اور ہمارے ہم وطن ترقی کی شاہ راہ پر گام زن ہو چکے ہیں۔ انگریزوں نے انھیں عزت وشہرت کے منصب پر فائز کر دیا ہے۔

اس کے برعکس ہم مکمل طور پر تباہ و برباد ہو چکے ہیں، ہمارے لیے آئندہ بھی ترقی کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ تو مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے لیے نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ چناں چہ مسلمانوں کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب ''انڈین مسلمانز'' میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ:

''1852ء سے 1868ء تک جن ہندستانیوں کو وکالت کے لائسنس دیے گئے، ان میں 239/ ہندو تھے اور صرف ایک مسلمان۔''

اس انکشاف سے آپ کو اپنے آبا و اجداد کی زبوں حالی کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔

تعلیمی حالت: جنگ آزادی کے بعد مسلمان تعلیمی اعتبار سے بہت ہی مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ مسلمان جو اپنے دورِ اقتدار میں علم و فضل میں سب سے افضل سمجھے جاتے تھے، ہندوؤں کے مقابلے میں ان کا تناسب بہت کم ہو گیا تھا۔ اس کا اندازہ آپ اس حقیقت سے لگا سکتے ہیں 1870ء میں ممبئی، چنئی اور کولکاتا یونیورسٹیوں میں 517/ گریجویٹوں میں صرف 70/ مسلمان تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کے علاوہ مسلمان بعض دوسری وجوہات کی بنا پر بھی انگریزی اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے سے گریز کرتے تھے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

1- درس گاہوں میں عربی اور فارسی تعلیم بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

2- مسلمان اساتذہ کی تعداد بہت قلیل تھی اور غیر مسلموں کی بہت زیادہ۔ اس وجہ سے مسلمان اپنے بچوں کو غیر مسلم اساتذہ سے تعلیم دلانا معیوب سمجھتے تھے۔

3- مسلمان طلبہ کو جمعہ کی نماز ادا کرنے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ غیر مسلم درس گاہیں دن بہ دن قائم ہو رہی تھیں، اسی وجہ سے مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی کا جرم حکومتِ برطانیہ پر عائد ہوتا ہے۔

اقتصادی حالت: جنگ کے بعد مسلمان اقتصادی طور پر بالکل تباہ ہو چکے تھے۔ وہ بڑی مصیبت اور پریشانی میں اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی تمام جائدادیں چھین لی گئی تھیں۔ سرکاری محکموں میں انھیں ملازمت نہیں ملتی تھی اور بے حیائی اس قدر غالب تھی کہ حکومت کی جانب سے یہ اعلان تھا کہ مسلمان ملازمتوں کے لیے درخواست دینے کے اہل نہیں۔

سر ولیم ہنٹر نے کلکتہ کے ایک اخبار کی شکایت کچھ اس طرح نقل کی ہے:

''تمام ملازمتیں اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ، مسلمانوں سے چھینی جا رہی ہیں اور دوسری قوموں بالخصوص ہندوؤں کو بخشی جا رہی ہیں۔''

غرض ہر میدان میں مسلمان زبوں حالی کے دور دورے سے گزر رہے تھے۔ مسلمان اساتذہ نکال دیے گئے۔ مفکرین کا کہنا ہے کہ مسلمان بچے چیتھڑوں میں نظر آتے تھے۔ یہی وہ بال و پر کا جمود تھا، جس کے خاتمے کے لیے ہمارا شاعر سپاہی بن کر ٹکرانے کی کوشش کرتا ہے:

دیکھ خوں خوار درندوں کے وہ غول
میرے محبوب وطن کو وہ نگل جائیں گے
ان سے ٹکرانے بھی دے
جنگ آزادی میں کام آنے بھی دے

☆☆☆☆☆☆

......(ص:103 کا بقیہ)......

حکیم صاحب نے صرف ایک فرزند مولوی میاں رحیم بخش یادگار چھوڑے جو مئی 1857ء میں پیدا ہوئے اور فروری 1920ء میں انتقال فرمایا۔ وہ بہت زیرک اور عقل مند تھے۔ میاں رحیم بخش کے ایک صاحب زادے مولوی میاں مشیت اللہ قادری تھے جو 1889ء میں پیدا ہوئے اور اکتوبر 1959ء میں دادو (سندھ) پاکستان میں وفات پائی۔ ان کو فارسی ادب پر یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ تاریخ وانساب پر گہری نظر تھی۔ تمام عمر سیاحت و تجارت میں گزار دی اور حالاتِ رجال میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ میاں مشیت اللہ قادری کے چار لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔ بڑے صاحب زادے منشی عبدالقیوم بدایوں میں 1943ء میں انتقال کر گئے تھے، تین صاحب زادے اور چار لڑکیاں موجود ہیں۔

1- پروفیسر محمد ایوب قادری: پروفیسر صاحب آج کل اردو کالج کراچی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں اور ملک کے ممتاز مورخین میں سے ایک ہیں۔ تاریخ ان کا دل پسند موضوع ہے۔ سیکڑوں کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ 2- عنایت اللہ قادری، 3- محمد نعمت اللہ قادری۔ یہ صاحب زادے کتب فروشی کا کاروبار کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

کتب خانوں، مدرسوں اور خانقاہوں کی بربادی

پروفیسر محمد ایوب قادری

دہلی مسلمانوں کی ساڑھے سات سو سالہ تہذیب کا قدیم مرکز تھا۔ اس سرزمین میں بڑے بڑے علما و فضلا پیدا ہوئے، بہت سے مدارس اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں، علوم و فنون اور تاریخ و ادب کا مرکز رہا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے ہزاروں انسانوں کو بے دریغ قتل کیا اور ہزاروں عمارتوں کو ڈھا دیا اور منہدم کیا، بہت سی درس گاہیں اور مدرسے ویران و برباد ہوئے۔ سیکڑوں علما و فضلا اور شعرا و ادبا گولیوں کا نشانہ بنے۔ صہبائی و میر پنجہ کش جیسے استاذانِ زمانہ مارے گئے، بہت سے کتب خانے برباد ہوئے۔ سلاطینِ دہلی کے سیکڑوں برس کے ذخیرے اور علما کی قدیم کتابیں برباد ہوئیں۔

شاہی قلعہ کے کتب خانے کی بربادی سب سے بڑا سانحہ ہے۔ یہ وہ کتب خانہ تھا جس میں ہمایوں کے ذخائر تھے، جس میں ہمایوں کے حکم سے ترجمہ کی ہوئی اور جمع شدہ کتابیں تھیں، جس میں جہاں گیر کی مساعی اور کاری گری کے نمونے تھے۔ غرض کہ یہ ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ بعض اوقات حضرت شاہ عبدالعزیز بھی قلعے سے کتابیں منگاتے تھے۔ اسی طرح میاں نذیر حسین قلعے کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے۔ یہ کتب خانہ ایسا مٹا کہ نام و نشان نہ رہا۔

مفتی صدر الدین رحمۃ اللہ علیہ نامی گرامی عالم تھے۔ بہت سے علما ان کے شاگرد تھے۔ مدرسہ دار البقا کو انھوں نے زندہ کیا۔ مفتی صاحب کے پاس ایک اچھا کتب خانہ تھا۔ سقوطِ دہلی کے بعد مفتی صاحب بھی گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، بڑی مشکل سے آدھی جائداد واگزاشت ہوئی، لیکن کتب خانہ واپس نہ ہوا۔ لارڈ لارنس سے خاص طور سے اس سلسلے میں درخواست کی گئی۔ مولف حدائق حنفیہ رقم طراز ہیں:

''1273ھ میں دہلی کے غدر میں آپ کو سخت زخمِ چشم پہنچا کہ تعلق روزگار بھی ہاتھ سے گیا۔ اور تمام جائداد و املاک بھی جو تیس سال کی ملازمت میں پیدا کی تھی، سرکار میں ضبط ہو گئی۔ بلکہ جہاد کے فتوے کے اشتباہ میں چند ماہ تک نظر بند رہے، آخر کو رہائی پا کر لاہور تشریف لائے اور واسطے اپنے کتب خانے مالیتی تین لاکھ روپے کے جو دہلی کی لوٹ میں نیلام ہو گیا تھا، حضور لارڈ جان لارنس کے پاس گئے، اس وقت پنجاب کے چیف کمشنر تھے اور مولانا ممدوح کے دہلی میں مہربان رہ چکے تھے، مطالبہ کیا، لیکن چوں کہ جائداد منقولہ کے نیلام کا واپس ہونا متعذر تھا اس لیے اپنے مطلب میں کامیاب نہ ہوئے۔''

(حدائق الحنفیہ، ص:483)

نواب ضیاء الدین خاں نواب احمد بخش کے فرزند تھے۔ لوہارو سے ان کے حصے کی رقم ملا کرتی تھی۔ اردو فارسی کے ادیب و شاعر تھے۔ اردو میں نیر اور فارسی میں رخشاں تخلص کرتے تھے، تاریخ کے بڑے عالم تھے۔ ان کے پاس ایک اچھا کتب خانہ تھا۔ وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ کتابوں کی فراہمی پر صرف کرتے تھے۔ ہندستان کی ضخیم تاریخ ایلیٹ نے آٹھ جلدوں میں لکھی ہے۔ نواب ضیاء الدین کے کتب خانے سے ایلیٹ کو سب سے زیادہ مدد ملی۔ اس نے آٹھویں جلد میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ نواب ضیاء الدین مرزا غالب کی نظم و نثر کو خاص طور سے محفوظ رکھتے تھے۔ مرزا صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میرا ایک سبتی بھائی ہے نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ، وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا ہے۔ چناں چہ مجموعۂ نثر اور کلیات نظم اردو، سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے، وہ کتب خانہ کہ ڈر کر عرض کر رہا ہوں بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا، لٹ گیا،

ایک ورق نہیں رہا۔" (خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر)

دلی کے ایک رئیس زادے حسین مرزا تھے جو حسام الدین حیدر خاں کے فرزند اور نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے نواسے تھے۔ مرزا غالب سے بڑے خاص تعلقات تھے، بلکہ مثل ان کے عزیزوں کے تھے ان کا بڑا اچھا کتب خانہ تھا، وہ بھی بری طرح برباد ہوگیا۔ مرزا غالب لکھتے ہیں:

"بھائی ضیاء الدین صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی، فارسی، نظم ونثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے، سوان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی، نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا۔" (خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر)

کلیم اللہ جہان آبادی کا مقبرہ اجڑ گیا، ولی کامل تھے۔ ان کی خانقاہ میں دیگر خانقاہ کی طرح کتب خانہ تھا، اس کے علاوہ شیخ کا کلام وغیرہ بھی تھا۔ جب بربادی ہوئی تو شیخ کے تبرکات اور کتب خانہ بھی برباد ہوگیا۔ مرزا غالب یکم دسمبر 1863ء کے ایک خط میں حکیم احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں:

"شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مقبرہ اجڑ گیا، ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ ان کے گاؤں کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ وہاں کے رہنے والے گولی سے بچ گئے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہے کہ کہاں ہوں گے۔ ان کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا، کچھ تبرکات بھی تھے، اب وہ لوگ نہیں ہیں کس سے پوچھوں؟" (خطوط غالب، جلد دوم، ص:138)

غرض یہ ان کتب خانوں کی نشان دہی ہو سکی ورنہ بہت سے علمی ذخائر اور کتب خانے ایسے برباد ہوئے کہ آج ان کی نشان دہی بھی مشکل ہے۔

مدرسوں اور خانقاہوں کی ویرانی: ان کتب خانوں کے علاوہ بہت سے علمی مراکز اور تہذیبی وثقافتی ادارے بھی ختم ہو گئے، ان میں سے دہلی کالج خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اس کے علاوہ مفتی صدر الدین آزردہ کا مدرسہ دار البقا ختم ہوا۔ جس سے سیکڑوں طالب علم فارغ ہو کر نکلتے تھے۔ ان کے علاوہ بزرگوں کے روحانی مراکز اور خانقاہیں بھی برباد ہو گئیں، کئی نام ور بزرگ اور مشائخ حجاز کو ہجرت کر گئے۔

حضرت کلیم اللہ جہان آبادی کی خانقاہ دہلی کی مشہور خانقاہ تھی۔ اس کی بربادی کا ذکر غالب کے خط میں اوپر کیا جا چکا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت شاہ فخر الدین کا خاندان بری طرح برباد ہوا۔ حضرت کالے صاحب نبیرہ شاہ فخر الدین بادشاہ کے پیر تھے، ان کے ہزاروں عقیدت مند تھے۔ اس خاندان کے متعلق مرزا غالب حکیم احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں:

"خود یہاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا، جیسے جھاڑو پھیر دی، کاغذ کا پرزہ، سونے کا تار پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔" (خطوط غالب، ج:2، ص:138)

یہاں کالے صاحب کے فرزند میاں نظام الدین سخت مشکلات میں مبتلا ہوئے اور شہروں شہروں مارے مارے پھرے۔ (قیصر التواریخ، ج:2، ص:460)

مرزا غالب انوار الدولہ کو لکھتے ہیں:

"حال صاحب زادے میاں نظام الدین (فرزند کالے میاں) کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر سے بھاگے تھے وہاں یہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے، اورنگ آباد میں رہے، حیدر آباد میں رہے۔ سال گزشتہ جاڑوں میں یہاں آئے، سرکار سے ان کی صفائی ہوگئی لیکن صرف جاں بخشی ہوگئی۔" (خطوط غالب، ج:2، ص:56)

اس کے علاوہ حضرت مرزا جان جاناں کی خانقاہ برباد ہوئی۔ اس خانقاہ کے سجادہ نشیں شاہ احمد سعید صاحب تھے۔ شاہ صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی صاحب اس وقت کی دلی کے سربرآوردہ مشائخ اور علما میں سے تھے۔

جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو یہ دونوں بھائی حجاز کو ہجرت کر گئے۔ ان دونوں بزرگوں کے جانے سے دہلی سونی ہوگئی۔ (قیصر التواریخ، جلد:2، ص:463)

☆☆☆☆☆☆

خیر و خبر

عرسِ عزیزی میں حیاتِ حافظ ملت کا اجرا

احباب اہل سنت بالخصوص الجامعۃ الاشرفیہ اور حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ سے تعلق رکھنے والے حضرات کے لیے بڑی مسرت کا مقام ہے کہ اکابر اہل سنت کی ایک عظیم شخصیت حافظ ملت حضرت علامہ شاہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کی حیات و خدمات پر مشتمل کتاب "حیات حافظ ملت" مصنفہ مولانا بدر القادری مصباحی کا اجرا امسال عرس حافظ ملت کے مبارک ومسعود موقع پر جانشین حافظ ملت عزیز ملت حضرت علامہ عبدالحفیظ صاحب سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ کے مقدس ہاتھوں سے عمل میں آچکا ہے۔ کتاب میں حافظ ملت کے مرشدان، اساتذہ اور بعض اہم تلامذہ کے تذکرے بھی ہیں اور مبارک پور کی مختصر تاریخ بھی۔ اس طرح یہ کتاب تاریخ اشرفیہ، مبارک پور اور حیات حافظ ملت کا ایک حسین مرقع ہے۔ کتاب 920 صفحات پر مشتمل ہے اور المجمع الاسلامی ملت نگر، مبارک پور، اعظم گڑھ یو. پی. کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔

از: کاشف رضا، المجمع الاسلامی، ملت نگر

تربیت تصنیف کے شائق طلبہ توجہ دیں

الحمد للہ المجمع الاسلامی مبارک پور کا شعبۂ تربیت تصنیف جاری ہے۔ جو طلبہ کسی سنی درس گاہ سے فضیلت کی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور تصنیف وتالیف میں مہارت حاصل کر کے مسلکِ حق کی ترجمانی کا جذبہ رکھتے ہوں، وہ جلد اپنی درخواستیں بھیج دیں اور دس شوال 1429ء/ 11/ اکتوبر 2008ء بروز شنبہ 8/بجے صبح ٹسٹ کے لیے المجمع الاسلامی حاضر ہوں۔

محمد عبد المبین نعمانی
نگراں شعبۂ تربیت تصنیف، المجمع الاسلامی، ملت نگر
مبارک پور، اعظم گڑھ، (276404) موبائل: 09838189592

مولانا محمد ادریس بستوی کا ایک وضاحتی بیان

آج سے چند سال پہلے جامعہ عربیہ سلطان پور کے جلسۂ دستار بندی میں میری شرکت ہوئی تھی، اس اجلاس میں جامعہ عربیہ کے اساتذہ اور دیگر علمائے کرام بھی موجود تھے۔ اس اجلاس کی رپورٹنگ کرتے ہوئے سہ روزہ مرکز "لکھنؤ" کے نامہ نگار نے یہ لکھ دیا کہ مولانا بستوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ "مسلمان کسی بھی امام کے پیچھے نماز پڑھیں۔"

مذکورہ رپورٹ بالکل جھوٹ اور قطعاً غلط ہے، میں نے اپنی تقریر میں یہ بات ہرگز نہیں کہی ہے، بطور گواہ جامعہ عربیہ کے تمام علما اور دیگر موجود علمائے کرام ہیں۔

مذکورہ اخبار کے اس حصہ کی فوٹو کاپی کروا کر کچھ لوگ تقسیم کرتے رہتے ہیں مگر مجھ سے براہِ راست کوئی دریافت نہیں کرتا۔ میں پوری وضاحت سے پھر کہتا ہوں کہ میں نے ایسی کوئی تقریر نہیں کی ہے۔ اس اجلاس میں میں نے بہت سی باتوں کے ساتھ یہ کہا تھا کہ اگر کوئی مسلمان کسی اجنبی جگہ پہنچ گیا، وہاں نماز کی جماعت ہو رہی ہے اور کسی ذریعہ سے یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ یہ لوگ کس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں تو جماعت ترک نہ کرے، نماز پڑھے، البتہ اگر بعد میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ اپنی جماعت کے نہیں تھے تو فوراً اپنی نماز دُہرا لے اور اگر یہ معلوم ہو کہ اپنی ہی جماعت تھی تو سبحان اللہ جماعت کا ثواب بھی ملا اور نماز بھی ہوگئی۔

میں نے اپنی تقریر میں جو کہا تھا اب اس کا جزئیہ بھی فتاویٰ رضویہ سے ملاحظہ کر لیا جائے۔

مسئلہ: کسی مسجد میں جماعت طیار ہے، لیکن اتنا وقت نہیں کہ دریافت کیا جائے کہ امام سنی ہے یا وہابی تو جماعت سے نماز پڑھنا چاہیے، یا اپنی علاحدہ؟

الجواب: جب کہ شبہہ کی کوئی وجہ قوی نہ ہو، جماعت سے پڑھے پھر اگر تحقیق ہو کہ امام وہابی تھا، نماز پھیرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(از فتاویٰ رضویہ، ج:3، ص:250، مطبوعہ سنی دار الاشاعت، مبارک پور)

از: محمد ادریس بستوی

دار العلوم قادریہ گلشن برکات میں دار الافتا کا قیام

دار العلوم قادریہ گلشن برکات انٹیا تھوک ضلع گونڈہ یو۔ پی۔ میں 8/جون 2008ء بروز اتوار دار الافتا کے قیام کی ایک عظیم الشان تقریب منعقد ہوئی، جس کی سرپرستی عزیز ملت حضرت علامہ شاہ عبد الحفیظ صاحب قبلہ سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور نے فرمائی۔ اس پروگرام میں دار العلوم کے تمام اساتذہ، طلبہ، منتظمین اور قرب وجوار کے کثیر لوگ موجود تھے۔

محقق مسائل جدیدہ حضرت علامہ مفتی محمد نظام رضوی صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ مبارک پور کا ایک توضیحی خطاب ہوا، جس میں انھوں نے موجودہ دور میں دار الافتا کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالی اور دار الافتا پر اسلام دشمن عناصر کی کڑی نظر کی بنیاد پر مفتیانِ کرام کی غیر معمولی ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں سامعین کو شریعت کے بتائے ہوئے خطوط پر چلنے کی تلقین کی اور نا معلوم مسائل میں علماے کرام کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دی۔ حضرت عزیز ملت دامت برکاتہم القدسیہ نے مدرسے کی ترقی اور بڑھتے ہوئے شعبہ جات پر اپنی مسرتوں کا اظہار کیا اور ناظم ادارہ حضرت مولانا مفتی عبد الحق رضوی کی خدمات کو سراہا اور ان کی ہمتوں اور حوصلوں پر انھیں مبارک باد پیش کی۔ اخیر میں ناظم ادارہ حضرت مولانا مفتی عبد الحق رضوی مصباحی نے پروگرام کی کامیابی پر اپنے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ حضرت عزیز ملت کی دعاؤں پر یہ افتتاحی تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ اس موقع سے مفکر اسلام علامہ محمد ادریس بستوی مصباحی نائب ناظم جامعہ اشرفیہ اور شہزادہ حضور شارح بخاری ڈاکٹر محب الحق رضوی گھوسی بھی شریک جشن رہے۔

از: منجانب مدرسہ گلشن برکات، گونڈہ، یو۔ پی۔

ایک اہم اعلان

جامعہ حضرت نظام الدین اولیا ہندستان کا وہ منفرد ادارہ ہے جہاں جہاں دو سالہ جامع نظام تعلیم کے ذریعہ مدارس اہل سنت سے فارغ شدہ علما کو بین الاقوامی سطح کا مبلغ اور قائد بنانے کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ اب تک اس ادارہ میں صرف مدارس اہل سنت سے فضیلت کی ڈگری حاصل کرنے والوں کو داخلہ دیا جاتا تھا مگر اب جامعہ کے ارباب حل وعقد نے جامعہ کے پروگرام میں مزید توسیع کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مدارس اہل سنت سے عالمیت کی ڈگری حاصل کرنے والے بھی جامعہ میں داخلہ کے مجاز ہوں گے۔

لہذا جامعہ میں داخلہ لینے والے خواہش مند طلبہ جلد سے جلد اپنی درخواست جمع کرائیں اور 50/روپے کا M.O. بھیج کر جامعہ کا نصاب تعلیم منگوالیں۔

تحریری امتحان: 11/ اکتوبر 2008ء بروز شنبہ بوقت 9 بجے صبح

امتحان شعبۂ حفظ وقراءت: 14/ اکتوبر 2008ء بروز منگل 9 بجے صبح

تقریری امتحان: 12/ اکتوبر 2008ء بروز یک شنبہ بوقت 9 بجے صبح

از: مینیجنگ کمیٹی، جامعہ حضرت نظام الدین اولیا

بلگرام شریف میں عرس خواجۂ پاک

6 رجب المرجب 1429ھ/10 جولائی 2008ء بروز پنج شنبہ بلگرام شریف کے محلہ میدانی پورہ میں واقع دار العلوم "الدعوۃ الصغریٰ" کے وسیع صحن میں سرکار خواجۂ پاک کا جشن زریں منعقد ہوا۔ یہ ادارہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی مہرولی شریف کے ارشد خلیفہ، فاتح بلگرام، مجمع البحرین، جملہ سادات زیدی، واسطی، بلگرامی کے جد اعلیٰ حضرت شاہ سید محمد صاحب الدعوۃ الصغریٰ علیہ الرحمہ کی روشن یادگار ہے۔ اس ادارے میں منعقد جشن میں شعراے اسلام وعلماے کرام نے نعت ومنقبت اور گراں قدر خطابات سے نوازا۔ خصوصیت کے ساتھ مولانا مختار احمد بہیڑوی، مولانا محمد ناظم علی رضوی مصباحی استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور، مولانا مظفر حسین حشمتی نے عطاے رسول، سلطان الہند خواجۂ پاک کی شخصیت پر خطاب فرمایا اور خانقاہ عالیہ قادریہ چشتیہ صغرویہ کے سادات ومشائخ اور گل گلزار واسطیہ مخدوم ملت حضرت مولانا سید شاہ اویس مصطفیٰ قادری واسطی بلگرامی کی روشن خدمات پر روشنی ڈالی۔ اخیر میں خانقاہ مذکورہ کے سجادہ نشین حضرت سید شاہ اویس مصطفیٰ دامت برکاتہ نے مختصر گراں قدر خطاب فرمایا اور قل خوانی اور دعا فرمائی۔ سامعین میں مقامی و بیرونی حضرات خاصی تعداد میں تھے۔ دار العلوم کے اساتذہ حافظ وقاری محمد احسان نوری و مولانا ابو القیس وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

از: محمد نور الحسن استاذ دار العلوم الدعوۃ الصغریٰ، بلگرام شریف

R.N.I. No.: 29292/76
Regd No.: AZM/N.P.28
THE ASHRAFIA MONTHLY
Mubarakpur, Azamgarh (U.P.)-276404 Phone:(05462)250092, 250149, Fax:251448
http://www.aljamiatulashrafia.org
E.mail: info@aljamiatulashrafia.org
انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر
شائع کرنے پر
ادارہ
ماہ نامہ اشرفیہ
کو
دلی مبارک باد
ضلع فتح پور یوپی کی مرکزی دینی درس گاہ
مدرسہ شمس العلوم سنگاؤں، فتح پور
الحمدللہ اس وقت ادارہ ہذا میں تقریباً ایک سو بیرونی طلبہ کے خورد ونوش اور متحرک وفعال اساتذہ کے ذریعہ عمدہ تعلیم و تربیت کا معقول انتظام ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً 750 مقامی طلبہ بھی زیر تعلیم ہیں۔ حفظ وقراءت اور درس نظامی کے علاوہ منی آئی ٹی آئی، درجۂ پرائمری سے انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم کا بھی مستقل الگ عمارت میں عمدہ بندوبست ہے۔ آئندہ بچیوں کی دینی وعصری تعلیم وتربیت کے لیے شعبۂ نسواں، تحقیق ومطالعہ کے لیے ایک معیاری لائبریری، پورے ضلع میں سنیت کے فروغ کے لیے ہر گاؤں میں مکاتب کا قیام، کوچنگ سنٹر سول سروسز اینڈ ادرس کمپٹیشن کے انتظام وانصرام کا ارادہ ہے۔ لہذا اہل خیر حضرات سے خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔
رابطے کا پتہ
منیجر مدرسہ شمس العلوم، مقام و پوسٹ سنگاؤں، ضلع فتح پور، یو. پی. 212601
موبائل: 9450236170, 9451768136, 9794669786